

دینی مندرجے

پونہ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے سال ۱۹۸۲ء میں منظور شدہ مقالہ

ڈاکٹر مجید بیدار

(ایم۔ اے۔ ایم۔ فل۔ پی ایچ ڈی)

—: نگران —:

ڈاکٹر اے بن شیخ امانت

پروفیسر انچارج، پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز ان پونہ یونیورسٹی۔ پونہ

ب

پہلا نام: سید عبدالحمید

قلمی نام: حمید بیدار

قابلیت: ایم۔ اے۔ ایم۔ فل۔ پی ایچ ڈی

پیشہ: لکچرار شعبہ اُردو مولانا آزاد کالج اورنگ آباد۔ مہاراشٹر

پیدائش: بمقام پرگی ۱۶ مئی ۱۹۵۶ء

سکونت: نواب پورہ اورنگ آباد - 431001



جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

پہلی اشاعت: دسمبر ۱۹۸۵ء

تعداد: ایک ہزار

مقام طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد

کتابت: محمد غالب

ناشر: مکتبہ شاداب

قیمت: ۶۰ (ساتھ) روپے

(مہاراشٹر اُردو اکاڈمی کی جنوری امداد سے شائع کردہ)

فہرست

مقدمہ

پیش لفظ

باب اول : تذکرہ نگاری کا فنی جائزہ۔

۱۰ تا ۱

۲۹ تا ۱۲

فنی تذکرہ کے تقاضے - تذکرہ کا لزوم

تذکرہ کی جدیدیات - تذکرہ کا معیار - ادب میں تذکرہ کا اثر

۸۳ تا ۲۸

باب دوم : تذکرہ نگاری کا اقسام۔

سوانح نگاری - خودنوشت سوانح - یادداشت

روزنامہ - سفرنامہ ، ملفوظات - سرگزشت

۱۱۰ تا ۸۸

باب سوم : تذکروں کی درجہ بندی۔

تذکروں کی گروہی تقسیم - مذہبی تذکرہ -

سماجی تذکرے - انسائیکلو پیڈیا کی تذکرے

صنفی تذکرے - آئینی تذکرے

۱۴۸ تا ۱۱۲

باب چہارم : دکنی تذکروں کا آغاز و عہد۔

قطب شاہی دور - عادل شاہی دور

نظام شاہی دور - برید شاہی دور

عالمگیری دور - آصفی شاہی دور

۱۴۷ تا ۱۵۰

باب پنجم : غیر مطبوعہ دکنی تذکروں کا تحقیقی جائزہ۔

آثار الادب - تذکرہ جوہر فرد

تذکرہ خاندان نواب رفعت الملک

تذکرہ خوشنویسان - تذکرہ شعراء

تذکرہ طوطیان ہند۔ تذکرہ عطائے تمکین۔ ریاضِ حسنی۔
باب ششم : دکنی تذکروں کی امتیازی خصوصیات

۱۷ تا ۱۹۹

تذکرہ بطور کارنامہ ملازمت۔ تذکرہ بطور تاریخ ادارہ
 تذکرہ بطور ذخیرہ معلومات۔ تذکرہ بطور تاریخ عمارت
 تذکرہ بطور شجرہ۔ تذکرہ بطور خطیہ و خطابات
 تذکرہ بطور سیرت۔ تذکرہ بطور شخصی سوانح
 تذکرہ بطور ادبی سوانح۔ تذکرہ بطور مذہبی سوانح
 تذکرہ بطور تاریخ۔

باب ہفتم : دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت :

۲۰۲ تا ۲۲۹

(الف) تذکروں کے محاسن۔ ہمہ جہتی اظہار۔ روایت پرستی۔
 مودخانہ شعور۔ ہمسائی مزاج۔ ذاتی غور و فکر
 انتخاب کا معیار۔
 (ب) تذکروں کے مضامین :

زبان کا سقم۔ غیر تفصیلی مواد

ہمدردانہ رویہ۔ مت کوک حوالے و ماخذات

۲۳۲ تا ۲۴۰

کتابیات :

(الف) فہرست ماخذات

(ب) بیاض و سلاسل کے تذکرے

(ج) دکن میں مطبوعہ تذکروں کی فہرست

(د) غیر مطبوعہ دکنی تذکروں کی فہرست

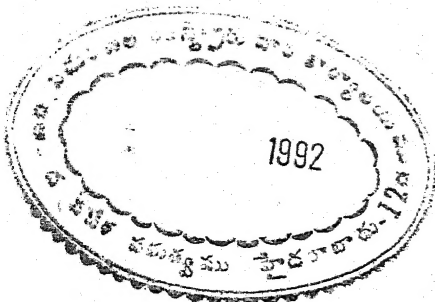
انتساب

والدہ ماجدہ

حضرت سیدہ محمودہ بیگم صاحبہ
کی خدمت میں

جن کی مادرانہ شفقت نے مجھے کم سن بنا دیا اور جن کی بے نور آنکھیں
میری ترقی کی معراج کو دیکھنے کے لیے خدا سے بیٹائی طلب
کرتی ہوئی بے چین نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر حمید بیدار



ہدیہ تشکر و سپاس گزاری

- ڈاکٹر سیدہ جعفر • یسین شریف
- ڈاکٹر نظام الدین گوریکر • سید صفر حسین
- اختر الزمان ناصر • ممتاز جہاں صدیقی
- ڈاکٹر مظہر محی الدین • نعمت الدین صاحب ایڈیٹر شاداب
- اطہر علی اسد • ریاض شیخ

مصنف کی خدمات

- خونی جادوگر مطبوعہ سال ۱۹۶۶ء
- صوتی درس ۱۹۶۲ء
- دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ ۱۹۸۰ء
- کی ادبی خدمات آئندہ سراپر دیش اردو ایڈیٹی سے انعام یافتہ
- اردو سوانحی لغت زیر طبع
- اردو کتب انسائیکلو پیڈیا: زیر ترتیب
- اردو ادب خزینہ معلومات: ”

مقدمہ

ڈاکٹر مجید بیدار کی کتاب ”ذاتی تذکرے“ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے کے لیے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا ہے جس کی طرف محققین نے بہت کم توجہ کی ہے اور اس اعتبار سے ڈاکٹر مجید بیدار یقیناً قابل مبارکباد ہیں۔ ڈاکٹر بیدار نے ”تحفۃ الشجرار“ اور ”گلشن گفتار“ سے لے کر ”عالمگیری“ اور ”آصفی دور“ تک تمام تذکروں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

پہلے باب میں مصنف نے تذکرے کے فن سے بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ تذکرہ ”تالیف“ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقالے کے اس باب سے پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کے خیالات اور ان کے اقتباسات نقل کرنے پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ ادبی مسائل پر خود غور و خوض کر کے نتائج اخذ کیے ہیں۔ دوسرے باب میں تذکروں سے قریبی تعلق رکھنے والی تحریروں مثلاً روزنامہ، سوانح حیات، سفر نامہ، یادداشت اور خود نوشت وغیرہ کی ادبی نوعیت سے مدلل بحث کرتے ہوئے تذکرہ نگاری کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں بڑے سلیقے کے ساتھ تذکروں کی گروہ بندی کی گئی ہے اور انسائیکلو پیڈیا کی ”اور معنی“ کی اصطلاحوں کی مدد سے بھی تذکروں کی درجہ بندی کرتے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد چوتھے باب میں ڈاکٹر مجید بیدار نے ”عالمگیری“ اور ”آصف جاہی“ دور کے تذکروں کی تاریخی اور ادبی

اہمیت پر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور ان تذکروں کی منفرد خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ پانچواں باب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں تذکروں کی مختلف اقسام کے موضوعات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے ذخیرہ معلومات پر جس انداز سے بحث کی ہے اس سے مصنف کی ادبی بصیرت اور ذکاوت کا انداز ہوتا ہے۔ چھٹا باب اس لیے اہم ہے کہ اس میں کئی تذکروں کے محاسن و معائب پر مختلف عنوانات کے تحت تبصہ کیا گیا ہے۔ جس سے کئی تذکروں کی ادبی اور تاریخی اہمیت واضح ہوتی ہے اور یہ کئی تذکروں کی منفرد خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔

مقلے کے آخری باب میں غیر مطبوعہ کئی تذکروں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس باب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مجید بیدار میں تحقیق و تنقید کا اچھی صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ تحقیق و تنقید دونوں سے بخوبی آشنا ہیں۔ کتاب کے آخر میں تذکروں کی فہرست پیش کی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر مجید بیدار نے کس محنت، توجہ اور ادبی لگن کے ساتھ یہ مقالہ سپرد قلم کیا اور اس مقالے کی تیاری و طبع مطالعے، دیدہ ریزی، ادبی خلوص اور محنت و کاوش کا کتنا دخل ہے۔ مجھے امید ہے کہ ادبی حلقوں میں ڈاکٹر مجید بیدار کی اس کتاب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

پروفیسر سیدہ جعفر
صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

مارتھ ۱۹۸۵ء

شیر لفظ

دکن کا علاقہ اس اعتبار سے کافی زیرِ زیر رہا ہے کہ یہاں پر فنونِ لطیفہ کے فروغ کے لیے شاہی اور عوامی سطح پر جدوجہد کی گئی۔ فنونِ لطیفہ کی دیگر شاخوں میں شاعری اور ادب یہ ایسے وسیلے ہیں جنہیں دکن میں خاص مرتبہ دیا گیا اور سب سے پہلے اسی علاقہ سے ایک نئی زبان کی نشوونما کے لیے سازگار ماحول پیدا کیا گیا جو ابتدا میں دکنی کہلاتی اور دورِ حاضر میں ساری دنیا اسے "اردو" کے نام سے جانتی ہے۔ اسی اردو کے ابتدائی نمونے دکن کی سرزمین سے وابستہ ہیں اور اردو کا قدیم دور دکن سے رابطہ جوڑے ہوئے ہے۔

دکن میں نثر و نظم دونوں کا شہرہ رہا۔ دورِ حاضر کی تحقیقات سے یہ ثبوت مل چکا ہے کہ سب سے پہلے اردو نثر و نظم کا آغاز دکن ہی سے ہوا۔ اس خصوص میں مختلف تحقیقی مقالے، تنقیدی مضامین اور مقدمات لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن پیشتر کا تعلق نظم سے ہے۔ بہت کم محققوں نے "دکنی نثر" کی جانب توجہ کی، اگرچہ محققین نے اس جانب غور بھی کیا تو فنی طور پر مواد کی فراہمی پر توجہ نہیں کی گئی جس کا نتیجہ یہ رہا کہ دکنی نثر پر تحقیق کا کام اس بلندی کو چھو نہ سکا۔ جس کی اساس پر نظم و نثر پر تحقیق کے کام میں ہماری پیما ہو سکتی۔ اس کے علاوہ دکن میں تحریر کردہ نثر کی فنی طور پر تقسیم کی جانب بھی بہت

کم ترجمہ دی گئی۔ ان بے ضابطگیوں کو دیکھنے کے بعد دکن سے وابستگی اور دکنی کے طالب علم ہونے کی وجہ سے "دکنی نثر" کی پامالی دیکھی نہ گئی اور مزاج اردو ادب کی سب سے قدیم صنف نثر "تذکرہ" پر کام کرنے کی جانب راغب ہوا۔ فن تذکرہ پر تحقیقی مقالے اور مواد پر جب نظر کی تو اندازہ ہوا کہ اس عنوان پر دو اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تب ذہن اس جانب مائل ہوا کہ "دکنی تذکروں" پر تحقیق کی جانی چاہیے کیونکہ موجودہ دور میں تحقیق کے لیے تمام تر مواقع دستیاب ہونے کے باوجود محققین نے صرف دکن کے مذہبی رسالوں ہی کو دکنی نثر کا پیش رو مانا ہے جبکہ کئی تذکرے اس دور کی یادگار ہیں۔ چنانچہ اس عنوان پر مطالعہ کے دوران ایسے نادرا انکشافات ہوئے جن کو ایک مبسوط کتاب کی شکل دینا ضروری تھا۔ اس لیے اس تحقیقی مقالے کو فن، دور، یادگار اور انفرادیت جیسے عنوانات سے آراستہ کیا گیا ہے۔ تذکرہ کا فن اور اقسام سے بحث کرتے ہوئے اس کے عہد کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ دکن میں تحریر کردہ ایسے منفرد تذکروں کا جائزہ بھی اس مقالہ میں شامل ہے جو ہر لحاظ سے جدت پسندی کے علمبردار ہیں۔ شاید دکن ہی پہلا مسکن ہے جہاں تذکرہ نگاری کے فن میں ہنیت، انداز اور مواد کے نئے نئے تجربے کیے گئے جس کی بنیاد پر "دکنی تذکرے" اردو ادب میں منفرد حیثیت کے حامل قرار دیے گئے۔

دکنی شکار ناموں، مذہبی قصوں، داستاؤں، ہندو نصائح، سیر و مناقب، نور ناموں اور معراج ناموں پر تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ لیکن کسی محقق نے دکنی تذکروں پر تحقیقی کام نہیں کیا۔ قدیم کتب، ملفوظات اور نسخہ جات کو اکٹھا کر کے ان پر تحقیقی نگاہ ڈالنا اس لیے ضروری ہو گیا تھا کہ دکن میں پلنے والی اس صنف نثر میں ہزاروں قسم کی حدیثیں روار کھی گئی تھیں۔ اس غرض سے مواد کو اکٹھا کر کے ڈاکٹر آف فلاسفی کے حصول کے لیے کام کا آغاز کر دیا گیا اور اب یہ مقالہ اس حیثیت کا ضرور ہو گا ہے کہ اسے

دکنی ادبیات میں ایک اضافہ کا درجہ دیا جاسکے۔

"دکنی تذکرے" کے زیر عنوان مقالہ تحریر کرنے سے قبل یہ ضروری تھا کہ دکن کے حدود اربعہ قائم کیے جائیں۔ چونکہ یہ موضوع خالص تاریخ سے متعلق ہے۔ اسی لیے ابھی تک کسی ادیب نے اسے چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ جب تک علاقوں کا حقیقہ نہ ہوگا یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ دکنی تخلیقات اور خاص طور پر تذکروں کا احاطہ کیا جائے۔ چنانچہ قدیم دکن یعنی بندھیا چل سے لے کر اس کماری تک پھیلے ہوئے علاقے پر موجود مختلف سلاطین کی حکومتوں کے پس منظر میں دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت واضح کی گئی۔ چنانچہ دکن میں دکنی یا اردو کو پروان چڑھانے والے خاندان بہمنی سلطنت، قطب شاہی سلطنت گوکنڈہ عادل شاہی سلطنت بیجا پور، نظام شاہی سلطنت احمد نگر۔ برید شاہی سلطنت بیدر عماد شاہی سلطنت برار، مغلیہ سلطنت اورنگ آباد، مظفری خاندان گجرات، خاندان خاندان۔ خاندیس اور غوری خاندان مالوہ۔ یہ ایسے ستون ہیں جنہوں نے دکن پر نہ صرف حکومت کی بلکہ دکنی ادب کے فروغ میں بھی حصہ لیا۔ عہد حاضر میں آصفیہ خاندان، نوابان حیدر آباد اور نوابان میسور کی دیر سے بھی دکنی ادب کا ارتقاء ہوا۔ اس طرح دکنی ادب کا علاقہ گوکنڈہ۔ بیجا پور۔ احمد نگر۔ بیدر۔ برار۔ اورنگ آباد۔ گجرات۔ خاندیس۔ مالوہ۔ حیدر آباد۔ میسور اور مدراس کو احاطہ کیے ہوئے ہے جبکہ موجودہ دور میں دکن کافی محدود ہو گیا ہے۔ ان تمام علاقوں سے دکنی تذکروں کی نمائندگی کو مقالہ میں شامل کیا گیا ہے تاکہ عنوان کا حق ادا ہو سکے۔

دکنی تذکرے کے عنوان سے صرف دکنی زبان میں تحریر کردہ تذکرے مراد نہیں لیے جائیں گے بلکہ دکن میں اور اس کے مختلف علاقوں میں تحریر کردہ وہ تمام تذکرے اس عنوان کے تحت یکجا کیے جائیں گے جو دکنی ادیبوں کے کارناموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ دکنی تذکروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ مقالہ میں صرف غیر مطبوعہ تذکروں پر بحث کی گئی ہے۔

جبکہ مطبوعہ تذکروں کی فہرست کو آخر میں شمار کیا گیا ہے۔ دکن کے مطبوعہ تذکرے کتب خانوں میں دستیاب ہیں اور چونکہ ان پر بحث کے مقالے میں طوالت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے مطبوعہ دکنی تذکروں پر بحث سے احتراز کیا گیا ہے تاکہ موضوع غیر مربوط نہ ہونے پائے البتہ انفرادی نوعیت کے مطبوعہ تذکروں کو عنوان کی مناسبت سے ضرور زیر بحث لایا گیا ہے۔ دکن میں تحریر کردہ بیشتر تذکرے اپنی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہیں لیکن تذکرہ نوشہریا آثار الاذان، تذکرہ طوطیان ہند اور تذکرہ خاندان نواب رفعت الملک یہ ایسی غیر مطبوعہ تخلیقات ہیں جن میں حدت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مطبوعہ تذکروں میں تذکرہ ذاکرین، تذکرہ یومین شعرائے اردو، تذکرہ الخطابہ، تذکرہ اطباء جہد عثمانی، تذکرہ شعیب قانون، تذکرہ دارالعلوم وغیرہ یہ ایسے تذکرے ہیں جن کی بدولت دکنی تذکروں کے حق میں حدت پسندی کو رد کر دیا گیا۔ اس طرح دکن "فن تذکرہ" کی روایت کو پرعان چڑھانے میں انفرادی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔

تحقیقی ادب پارے کا درجہ مستحق کرنے کے لیے تنقیدی اور تحقیقی کارناموں کے ساتھ ابواب کی تشریح اور اس کے محاکماتی جائزہ کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ عام طور پر تحقیقی کارناموں میں حوالہ جات اور اضافی تشریحات کی اس قدر کثرت ہوتی ہے کہ عام قاری اس کے تفصیلی مطالعہ سے قبل تحقیقی مقالہ کے ابواب کے محاسبہ سے اس کی افادیت اور اہمیت و افادیت کا اندازہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ جس کی وجہ سے لازمی ہو جاتا ہے کہ ہر باب کے بارے میں مختصر مختصر وضاحت کے ساتھ انی ابواب کے بارے میں بھی اشارہ کیا جائے جو تحقیق کے دائرے میں ہوتے ہوئے بھی تحقیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی اہمیت رکھتے ہیں۔ موجودہ تحقیق میں صرف نوادرات، مخطوطات اور حوالہ جات کی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ ان کے استفادہ کے ذریعہ مقالہ نگار جن نکات کی تشریح و توضیح کرتا ہے انہیں بھی خصوصی مرتبہ دیا جاتا ہے۔ "دکنی تذکرے" مقالہ تحریر کرنے کے

دورانِ ابواب کی ترتیب میں اس بات کو خاص طور پر دھیان میں رکھا گیا کہ بابِ اول سے آخر تک صرف سرخیوں کے مطالعے سے قاری فنِ تذکرہ اور کئی تذکروں کے بارے میں اپنے ذہن میں ایک نقشہ مرتب کر سکے اور کئی تذکروں کی تمام تر تاریخ اس کے سامنے آجائے۔ اس غرض سے مقالہ کو، ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور آخر میں مطبوعہ تذکروں کی فہرست کے ساتھ ساتھ کتابیات کو بھی شامل کر دیا گیا ہے تاکہ مطالعہ کے دوران کسی قسم کی پیچیدگی نہ پیدا ہو اور قاری کو بآسانی مقصد حاصل ہو گا۔ مقالہ کا پہلا باب تذکرہ کے فن سے متعلق ہے۔ گو کہ متعدد کتابوں اور

رسائل میں تذکرہ کے فن کے بارے میں مضامین شائع ہوئے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ فنِ تذکرہ کی صنف کے بارے میں مواد فراہم کیا جائے۔ چنانچہ اس باب میں تذکرے کے تقاضے سے بحث کرتے ہوئے اس کی ترتیب و انتخاب کا جائزہ لیا گیا ہے جس کے بعد غالباً اردو ادب میں سب سے پہلے فنِ تذکرہ ایک تالیف ہونے سے متعلق بحث کی گئی ہے اور تذکرہ کے معیار کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ تذکرہ نگار کی ذاتی دل چسپی اور جدوجہد کی بنا ہی پر اس فن میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ اس باب کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس کے ذریعہ فنِ تذکرہ تخلیقی حیثیت کا درجہ رکھنے کے باوجود تالیفی خصوصیات کا حامل ہونے سے بحث کی گئی ہے جو اردو ادب میں سب سے پہلا قدم تصور کیا جائے گا۔

دوسرے باب کے ذریعہ تذکرہ سے استفادہ کرنے والے اصناف اور اس کی متبادل شکلوں سے بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تذکرہ ایک مرکب صنفِ سخن ہے اور اسے کئی اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ تذکروں کی مختلف قسموں جیسے ملفوظات، یادداشت، روزنامہ، سفرنامہ، سوانح حیات خودنوشت اور سرگزشت کی فنی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ

یہ تمام ذیلی اصناف فن تذکرہ کی خصوصیت کے نمائندہ ہیں۔ اسی لیے ان کا رشتہ تذکرہ سے گہرا ہے۔ تذکرہ کے فن کی اس انداز سے درجہ بندی اردو میں پہلی کوشش ہے۔ ابھی تک کسی بھی محقق یا ناقد نے اس قسم کی درجہ بندی نہیں کی تھی جس کے نتیجہ میں یہ باب بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

دکنی تذکرے کا تیسرا باب دل چسپی سے خالی نہیں کیونکہ اس باب میں مواد کے اعتبار سے اردو میں تحریر کردہ تمام تذکروں کی گروہ بندی کی گئی ہے۔ چنانچہ تذکروں کو مختلف گروہوں یعنی مذہبی تذکرے، ادبی تذکرے، سماجی تذکرے، انسائیکلو پیڈیا بی تذکرے، صنفی تذکرے اور انگریزی تذکروں میں تقسیم کر کے یہ ثابت کیا گیا کہ متن کے اعتبار سے بھی تذکروں کی تقسیم ممکن ہے۔ ابھی تک صرف ڈاکٹر حنیف نقوی نے اپنی کتاب "شعریئے اردو کے تذکرے میں" تذکروں کی گروہی تقسیم کا بیڑا اٹھا تھا لیکن انھوں نے تذکروں کو تذکرہ بالذات، تذکرہ بالعہدہ اور اس قسم کی تشبیحات سے مربوط رکھا۔ جبکہ مقالہ کے اس باب میں اردو کے تمام تذکروں میں پیش کردہ مواد کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان کے لیے موزوں عنوانات مختص کیے گئے ہیں جو انفرادیت کے ساتھ جنت پسندی کے بھی منظر ہیں کیونکہ اردو ادب میں ابھی تک کسی نے یہ طریقہ نہیں اپنایا۔

مقالہ کا چوتھا باب تاریخی اہمیت اور مورخانہ جدوجہد کا علمبردار ہے جس کے ذریعہ دکن میں تذکروں کے آغاز اور ان کے عہد کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دکن کے مختلف ادوار بہمنی، قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، برید شاہی عالمگیری، آصف جاہی خاندانوں کے ذریعہ فن تذکرہ کی ترقی اور ان ادوار کے تخلیق کاروں کی جدوجہد کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں دور قدیم سے لے کر عہد حاضر تک کے اہم تذکروں کی تاریخ اور ان کی ادبی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ یہ باب اس

درجہ سے اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے کہ دکنی ادبیات کی تاریخ مرتب کرنے کے دوران حکیم شمس اللہ قادری نے "اردو سے قدیم" اور نصیر الدین ماسمی نے "دکن میں اردو" میں وہ گوشے واضح نہیں کیے جہاں کا ذکر اس باب میں کیا گیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو "میں کسی قدر حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن دکنی تذکروں کے آغاز و عہد کے بارے میں ابھی تک کسی نے اس طرح تحقیقی جائزہ نہیں لیا جس طرح کہ اس باب میں شامل کیا گیا ہے۔

مقالہ کا پانچواں باب تحقیقی کوششوں کا عرق کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے دکنی تذکروں کی امتیازی خصوصیات واضح کرنے کے لیے ایسے تمام منفرد تذکروں سے بحث کی گئی ہے جو بیعت کی تبدیلی کے ساتھ فن تذکرہ میں جدید اضافہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے دکن میں تذکرہ کو جن جن طریقوں سے برتا گیا۔ اس پر تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ تذکرہ نگاروں کی منفرد مزاجی کو ظاہر کرتے ہوئے اس باب میں تذکرہ لکھنے کا نامہ ملازمت، تذکرہ بطور تاریخ ادارہ، تذکرہ بطور ذخیرہ معلومات، تذکرہ بطور تاریخ مہارت، تذکرہ بطور شجرہ، تذکرہ بطور تاریخ خطابات، تذکرہ بطور سیرت، شخصی تذکرے، ادبی تذکرے، مذہبی تذکرہ اور تاریخی تذکروں کے نمائندہ دکنی تذکروں کے اہم اقتباسات درج کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ دکن میں جس قدر بھی تذکرے لکھے گئے۔ ان تمام کو مجملہ ااحصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور ان ہی کی بدولت دکنی تذکروں کو اردو ادب میں خاص مرتبہ دیا جاتا ہے۔ یہ باب بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے انفرادیت پر قرار رکھتے ہوئے ہے۔

چھٹے باب کو دکنی تذکروں کے محاسن و معائب کے اظہار کے لیے مختص کیا گیا ہے تاکہ ان تذکروں کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو سکے۔ دکنی تذکروں کے محاسن کو بیان کرنے

کے لیے ۶ عنوانات محمد جہتی اظہار۔ روایت پرستی۔ مورخانہ شعور، لسانی مزاج، ذاتی غور و فکر اور انتخاب کا حیار کے ذریعہ دکنی تذکروں کی ادبی و معیاری حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح معاصی سے چشم پوشی بھی نہیں کی گئی۔ انھیں بھی ۶ عنوانات، زبان کے سقیم غیر تفصیلی مواد۔ بدمردانہ رویہ۔ مشکوک حوالے، غیر معتبر مآخذات، ذوق صحیح کی کمی کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس طرح اس باب کے ذریعہ دکنی تذکروں پر تنقید کرتے ہوئے غیر جانب دارانہ انداز میں تذکروں کے ہر پہلو سے بحث کی گئی ہے جس کی وجہ سے دکنی تذکروں کی اہمیت میں اضافہ ہو گا۔

غیر مطبوعہ دکنی تذکروں کے تحقیقی جائزے کو ساتویں باب میں جگہ دیتے ہوئے ایسے اہم تذکروں پر بحث کی گئی ہے جن کا ابھی تک کسی محقق نے تذکرہ تک نہیں کیا۔ ان علمی تذکروں کے عہد، مصنف، سن تالیف اور ان کی ادبی اہمیت کو تحقیقی انداز میں بیان کرتے ہوئے ان کی ہمہ جہتی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس باب میں صرف ریاض حسنی کے علاوہ دیگر تمام تذکروں کو ادبی دنیا میں پہلی بار روشناس کر دیا گیا ہے۔ آثار الادبانی۔ تذکرہ جوہر فرد۔ تذکرہ خاندان نواب رقت الملک، تذکرہ خوش نویسان، تذکرہ شعراء تذکرہ طوطیان ہند اور تذکرہ عطائے تمکین، یہ ایسے تذکرے ہیں جن کے تعارف پر کسی محقق نے توجہ نہیں کی۔ اس مقالہ میں سب سے پہلے انہیں متعارف کر دیا گیا ہے جس سے دکنی ادب کی ساکھ میں اضافہ ہو گا۔

مقالہ کے آخر میں مطبوعہ دکنی تذکروں کی فہرست دی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے لا تعداد تذکرے تحریر کیے۔ اس فہرست میں تذہبی۔ سیاسی۔ ادبی۔ معاشرتی غرض ہر قسم کے تذکروں کو شامل کر دیا گیا ہے۔ تاکہ فہرست کے مطالعہ سے دکنی ادب میں اس نئے اضافہ سے واقفیت ہو سکے۔ اس طرح مقالہ کو دور جدید کے تمام تحقیقی ذرائع سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۱ء کے

تین سالہ عہد میں اس مقالہ کی تکمیل ہوئی۔ ممکنہ طور پر قلمی نسخوں کو کام میں لاتے ہوئے تنقید و تبصرہ کے بعد انھیں ایواب میں جگہ دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی چند مطبوعہ تذکروں کو بھی ایواب میں شامل کیا گیا ہے تاکہ دکنی تذکروں کی انفرادیت واضح ہو سکے۔ غرض اس مقالے کی پیشکش کے بعد دکنی ادب چند نئے تذکروں سے مالا مال ہو جائے گا اور مادر وطن ہوتے کے ناطے مجھے اس علاقے کے تخلیقی کارناموں پر فخر کرنے کا موقع مل جائے گا۔

مقالہ تحریر کرنے کے دوران دکن میں اردو کے اہم مراکز برہان پور، دولت آباد اورنگ آباد، احمد نگر، بجا پور، قندھار، گلبرگ، بیدر، برار، خاندیس، گونکنڈہ حیدر آباد، بودھن، کرنول، کرٹپہ، ترحین پٹی، مدراس، بنگلور، میسور، بمبئی اور دیگر علاقوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ ان علاقوں سے متعلقہ مواد کچھ تو سفر کے ذریعہ حاصل کیا گیا اور کچھ ایوان اردو حیدر آباد، اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدر آباد، اسٹیٹ آرکائیوز حیدر آباد سے دستیاب ہوا۔ سالار جنگ میوزیم لائبریری سے خطوط کی دستیابی ممکن ہو سکی۔ جس کے لیے میں ان لائبریریوں کے حکام کا شکور گزار ہوں۔ مقالہ کی ترتیب کے لیے اطہر علی اسد اور سید اصغر حسین اور تحریر کے لیے بہن ممتاز جہاں صدیقی کچھ رسیوا جی کارڈ پر بھرتی کا تعاون حاصل رہا جبکہ مقالہ ٹائپ کرنے کے لیے یسین شریف نے اپنی خدمات دیں جن کا میں تہہ دل سے شکور گزار ہوں۔ مقالہ تحریر کرنے کے لیے رہنمائی اور ہر قدم پر مشورے سے نازنے والی ہستی پروفیسر ڈاکٹر امانت شیخ صاحب کی ہے جو نہ صرف میرے گائیڈ ہیں بلکہ کمر فرما بھی ہیں جن کی مشفقانہ رہنمائی اور مشوروں کی وجہ سے اس مقالہ کی تکمیل ممکن ہو سکی۔ ان کی ذات میرے لیے سچا کادر جبر رکھتی ہے۔ ان ہی کے مشورے کی بنا پر دکنی ادب کی ایک اہم صنف تذکرہ یہ مقالہ تحریر کیا جاسکا اور ان کی مدد شامل حال ہونے کی وجہ سے ہی اسے پونہ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے داخل کیا جاسکا۔ امید ہے کہ اس مقالے سے دکنی ادب خصوصاً دکنی نثر میں نئے گوشے اجاگر ہوں گے۔ ڈاکٹر جمید بیدار

باب اول

تذکرہ نگاری کا فنی حبابیرہ

ادب کی ایک قسم کی حیثیت سے تذکرہ نگاری اُردو نشر کی قیمتی یادگار ہے ایک صنفِ نثر اور اُردو کی پہلی آئینہ سودہ۔ قدیم طرزِ تحریر کی حیثیت سے تذکرے کی اہمیت اُردو ادب میں دو بالا ہو جاتی ہے۔ اُردو نشر میں یہ فن فارسی ادب سے مقترایا گیا۔ لیکن اس اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسی فن کی بدولت دورِ جدید میں اُردو ادب کی تاریخ مدون کرنے میں سہولت میسر آئی ہے۔ تذکرہ نگاری اور تذکرہ نگاری کی روایت، اُردو ادب کے مایہ ناز کارناموں اور شعراء کے حالات کی پیش کشی کا قیمتی ذریعہ ہیں۔ تذکرے کی اس اہمیت سے واقفیت کے بعد یہ ضرورت پیش آتی ہے کہ اس صنف کے فن میں کون سی خوبیاں پوشیدہ ہیں انہیں تلاش کیا جائے اور کن خصوصیات کی بنا پر یہ فن اُردو نشر کی تاریخ پر چھایا رہا دریافت کیا جائے۔ عام طور پر اُردو نشر کی مختلف اصناف، وقت و حالات اور زمانے کی دست دیر کا شکار ہو گئیں۔ لیکن تذکرہ ابھی تک اپنے فنی لوازمات کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ تذکرے کی یہ فعال صفت ثابت کرتی ہے کہ فنِ تذکرہ میں اس قدر جامعیت ہے کہ اس نے دورِ قدیم میں بھی اپنی حیثیت کو برقرار رکھا اور دورِ جدید میں بھی اس کا عمل دخل باقی ہے۔ اُردو ادب میں داستانِ نگاری مرحوم صنفِ ہوی اور ایسی ہی متعدد اصناف ہیں جو ادب

میں داستانِ پارینہ کی حیثیت حاصل کر گئیں لیکن تذکرہ اسی آب و تاب سے اپنی فنی خصوصیت واضح کر رہا ہے۔ جو میر کے دور سے اپنی فنی روایات کو قائم کیے ہوئے تھا۔ اگر دورِ جدید میں تذکرہ کی صنف فعال نہ ہوتی تو اردو کے نامور ادیب مولانا آزاد اپنی خود نوشت کا نام "تذکرہ" نہ رکھتے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ کی صنف روایتی اعتبار سے شروع ہوئی اور دورِ جدید تک اس کا اثر فنی میلانات کے ساتھ جاری و ساری رہا۔ تذکرہ نگاری ایک مجموعہ صنف کی حیثیت رکھتی ہے جس میں مختلف شخصیتوں کے چہرے ابھرتے ہیں اور ان کے کارناموں سے تذکرہ کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ فنِ تذکرہ صرف شخصیتوں کے خط و حال واضح کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ شخصیتوں میں پوشیدہ خصائل کو بھی واضح کرنے کا نام ہے جو ایک خوبی کی حیثیت سے شخصیت کی زندگی کا لازمہ بن گئے ہوں۔ چنانچہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اردو میں شاعروں اور ادیبوں کے تذکرے لکھے گئے جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ شاعر کی شخصیت میں پوشیدہ خصوصیت یعنی شعر گوئی اور ولی کی شخصیت میں پوشیدہ خصوصیت یعنی کرامات کو واضح کیا جائے۔ اس پس منظر میں اردو کے تمام تذکروں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاری کا سب سے پہلا اصول یہی ہے کہ انسان میں چھپی ہوئی صلاحیت اور اس سے مطابقت رکھنے والی دلچسپیوں کو واضح کیا جائے۔ تذکرہ نگاری کے فن کا یہ کلیہ اردو کے تمام اقسام کے تذکروں پر صادق آتا ہے۔ اس پس منظر میں تذکرہ کے فن کو شخصیت کے حالات بیان کرنے اور اس کی دلچسپیوں کی احاطہ بندی کرنے والی صنف کا نام دیا جاسکتا ہے۔

اصولی طور پر تذکرہ "ذکر" کے معنی سے مربوط ہے۔ عربی

تذکرہ کا فن :

سے اردو میں رواج پایا اور فارسی کے زیر اثر اردو ادب میں اس لفظ کو صنف کی حیثیت سے اردو میں رواج پایا اور فارسی کے زیر اثر اردو ادب میں اس لفظ کو صنف کی حیثیت

حاصل ہوئی۔ عام انداز میں تذکرہ یہ معنی ذکر کے مروج ہے۔ لیکن اصطلاحی اعتبار سے تذکرہ متعدد اشخاص کے حالات اور کارناموں کو ایک کتاب میں جمع کرنے کی شہادت دیتا ہے۔ یعنی تذکرہ ایک ایسی صنف ہے جس میں فن کے جلیل القدر اصحاب کی سوانح اور ان کی انفرادی خصوصیات کو واضح کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے تذکرہ کا فن ایک کتاب کا محتاج ہوتا ہے۔ یعنی جب تک کئی اہم شخصیتوں کو مبسوط نہ کیا جائے اس کی حیثیت تذکرہ کی نہ ہوگی۔ اس فنی جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ کے فن کے لیے سب سے بڑی ضرورت اشخاص کے حالات اور ان کے کارناموں کو جمع کر کے اُسے کتابی شکل دینا ہے۔ جب تک اس اصول کی تکمیل نہیں ہوگی کوئی بھی تحریر شدہ متن تذکرہ کے ضمن میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

فن تذکرہ کی ایک اہم ضرورت یہ بھی ہے کہ تذکرہ کی تحریر کے لیے ایک ہی فنی ماہر کو اشخاص کے حالات یکجا کیے جائیں اور انہیں تذکرہ نگار اپنی سہولت کے اعتبار سے ترتیب دے۔ یعنی اگر کوئی مؤلف کسی ایک شخصیت کے حالات اور کارناموں کو کتابی شکل دے گا تو تذکرہ کا نام دے تو فنی لحاظ سے اس کی حیثیت تذکرہ کی نہ ہوگی۔ چونکہ تذکرہ کے لیے لازم ہے کہ جس کتاب کو تذکرہ کا نام دیا جائے اس کا متن متعدد اشخاص کی سوانح اور دلچسپیوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہو۔ چنانچہ ایسی تمام کتابیں جو صرف ایک شخصیت کے حالات اور کارنامے بیان کرنے کے لیے لکھی گئیں۔ لیکن انہیں تذکرہ کا نام دیا گیا تو ان کی حیثیت فنی اعتبار سے تذکرہ کی نہ ہوگی۔ کیونکہ ان پر فن تذکرہ کا طلاق نہیں ہو سکتا چنانچہ تذکرہ بابر، تذکرہ جمیل، تذکرہ حسن، تذکرہ حسین، تذکرہ حمید الدین چشتی، تذکرہ سعید، تذکرہ مولوی مرتضیٰ عریض اس قسم کی تمام کتابیں تذکرہ کے فنی تقاضوں کی تکمیل نہ کرنے کی وجہ سے تذکرہ نہیں کہی جائیں گی۔ ہر فن کچھ تقاضوں کی پابندی کرتا ہے اور ان تقاضوں کی تکمیل ہی فن کی زندگی کی

علامت ہے۔ تذکرہ کا فن بھی کئی تقاضوں کا متحمل ہے اور تذکرہ نگار سے ان تقاضوں کی تکمیل کی توقع رکھنا ہے۔ ذیل میں تذکرہ کے تقاضوں سے بحث کی جائے گی۔

فن تذکرہ کے تقاضے

فقہی تمہیدوں کو پرکھتے ہوئے فن کے التزام کیلئے جو اصول بردے کا رول لائے جاتے ہیں انہیں فن کے تقاضوں کا نام دیا جاتا ہے۔ عام طور پر ہر فن چند روایتی اصولوں پر کاربست رہتا ہے جسے با شعور فن کار اپنے زمانے اور حالات کے رد و بدل کے اعتبار سے روایت سے نکال کر جدیدیت کے پیراہن سے سنوارتے ہیں۔ فن تذکرہ کے تقاضوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ درحقیقت تذکرہ کا فن روایتی تقاضوں کا بے انتہا پیابند ہے۔ اور تذکرہ نگاروں نے بھی ان تقاضوں کی بھروسہ پورتا نہ کرتے ہوئے ان کی تکمیل کو لازمی قرار دیا۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ میر تقی میر کی "نگار اشعار" سے لے کر عہد حاضر کے تذکرے تک ہر ایک میں فن تذکرہ کے روایتی تقاضوں کی پوری طرح تکمیل کی گئی ہے۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ فن تذکرہ نگاری میں تذکرہ کے تقاضے اصول کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

اعتدال اور توازن سے فن تذکرہ میں نزاکت پیدا ہوتی ہے جو تذکرہ کا پہلا تقاضہ ہے جس کے بغیر فن کی تکمیل ممکن نہیں۔ تذکرہ کا دوسرا تقاضہ حالات اور سوانح کے دوران اختصار ہے۔ یعنی تذکرہ کے دوران شخصیت کے حالات پیش کرنے کے لیے اختصار سے کام نہ لیا جائے تو تذکرہ سوانح میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ اعتدال اور توازن سے مراد تذکرہ نویس کا بیانیہ استدلال ہے جس کے دوران اسے صرف حقیقت کی عکس کشی سے کام لینا پڑتا ہے۔ جس کے ساتھ ہی اس پر لازم آتا ہے کہ بیان کے دوران وہ معتدل رویہ اور متوازن اسلوب اختیار کرے ورنہ تذکرہ تشنہ رہ جائے گا۔

تذکرہ کا تیسرا تقاضہ نقالی سے پرہیز ہے۔ جب تک تذکرہ نویس وقت نظر اور قوت فیصلہ کی خصوصیات کا حامل نہیں ہوتا اس وقت تک اس کا تذکرہ نقالی کی حیثیت میں رہے گا۔ عام طور پر اردو تذکرہ نگار خوش چینی، اکتساب اور استفادہ کا جو الزام لگایا جاتا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ چند اہم تذکرہ نگاروں کو سامنے رکھتے ہوئے شعردشاعری سے دل چسپی رکھنے والے متعدد افراد نے نقالی سے کام لیا ہے۔ جبکہ جن تذکرہ نویسوں نے جگہ کا دی کا ثبوت دیا۔ ان کے تذکرے ادبی طور پر اہمیت کے حامل سمجھے گئے جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ تذکرہ نقالی سے پرہیز کا تقاضہ بھی رکھتا ہے۔

مختلف شخصیات کی منفرد مزاجی اور ان کی شخصیت کے قابل تریف گوشوں سے واقفیت فن تذکرہ کے چوتھے تقاضے میں داخل ہے۔ جب تک تذکرہ نگار اس اصول کی تکمیل نہیں کرے گا اس وقت تک تذکرہ صرف شخصی حالات کا ایک موقع بنائے گا۔ تذکرہ کے اس تقاضہ کے ذریعہ اخذ و ترک کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ یعنی شخصیت کے حالات اور قابل تعریف واقعات کے بیان کے دوران فن تذکرہ کا تقاضہ ہے کہ اخذ و ترک سے کام لیا جائے۔ اگر یہ عمل کا فرما ہو گا تو تذکرہ مبسوط سوانح کی شکل اختیار کرے گا۔ اس تقاضہ کے ذریعہ صاحب شخصیت شاعر یا صوفی کے کارناموں کو مختلف کتابوں سے اخذ کرنے اور قابل اعتراض بیانات کو ترک کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ عام طور پر تذکرہ میں یہ عمل اس کی ادبی حیثیت کو دوبالا کرنے کا ضامن ہے۔ کیونکہ اسی عمل کے ذریعہ تذکرہ میں غیر ضروری متن سے پرہیز کر کے اہم اور ضروری معلومات کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں فن تذکرہ کے تقاضوں میں اخذ و ترک بڑی اہمیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔

فن تذکرہ کا پانچواں تقاضہ تذکرہ کی ترتیب و تدوین ہے جس کے بغیر

تذکرہ کا التزام ممکن نہیں۔ اس تقاضہ کے ذریعہ تذکرہ نگار جامع اصول اور نظم و ضبط کے ساتھ تخلص کے حرفِ اول کی رعایت یا حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق حالات اکٹھا کر کے انھیں تذکرہ کی شکل میں پیش کرتا ہے جس سے نہ صرف ترتیب میں اصولوں کی پابندی ظاہر ہوتی ہے بلکہ بآسانی کسی بھی شاعر کے حالات ترتیب کے لحاظ سے معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ تذکرہ میں ترتیب و تدوین کا عمل شاعر یا صوفی کے حالات اور کارناموں کی صحت کا ضامن ہے۔ یعنی تذکرہ نگار جس قدر ترتیب و تدوین میں اصول پسندی سے کام لے گا اُسی قدر اس کا تذکرہ جامع ترین قرار پائے گا۔ کیونکہ اسی عمل کے ذریعہ حالات کی تکرار اور شخصیت سے غیر متعلقہ مواد سے انحراف کیا جاسکتا ہے اس تقاضہ کے ذریعہ فنِ تذکرہ میں جامعیت اور موزوں متن کی پیش کشی کے لیے راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

کلام کی ترتیب فنِ تذکرہ کے چھٹے تقاضہ میں داخل ہے۔ جب تک ادبی تذکروں میں شعرا کے کلام کی ترتیب کو شامل نہ کیا جائے۔ تذکرہ کی حیثیت فنی اعتبار سے موزوں نہیں ہوگی۔ سبھی تذکروں میں صوفی یا دلی کی کرامت کو ترتیب میں شامل کیا جاتا ہے۔ غرض تذکرہ میں لازمی ہے کہ شاعروں کا منتخب کلام اور صوفی یا دلی کے منتخب کرامات یکجا کیے جائیں۔ جب تک اس عمل کی تکمیل نہ ہوگی تذکرہ کا فنی تقاضہ پورا نہ ہوگا۔ جہاں تک کلام کی ترتیب اور کرامات کی پیش کشی کا تعلق ہے یہ تذکرہ نگار کا فریضہ ہے کہ وہ معیاری اور قابلِ فہم کلام اور کرامات تذکرہ میں شامل کرے۔ معیاری تذکرہ کی یہی خصوصیت اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے کہ ان تذکروں میں شخصیت کے حالات کافی جالچ پڑناں کے بعد پیش کرنے کے علاوہ ان تذکروں میں شاعروں کا معیاری کلام شامل کیا جاتا ہے۔ اکثر تذکرے اس وجہ سے ادبی طور پر غیر معیاری قرار دیئے گئے کہ ان میں پیش کردہ فقہیہ کلام ترتیب کے اصولوں

کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ فرض ادبی تذکرہ میں معیاری کلام منتخب کرنا ایک ضروری شرط کا درجہ رکھتا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ ہر شاعر کا کلام اس طرح انتخاب کیا جائے کہ جس کے مطالعہ سے فن کی تمام خوبیاں اور خامیاں واضح ہو سکیں۔ یعنی انتخاب کے دوران کلام کے محاسن اور معائب پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ صرف معیاری یا غیر معیاری اشعار کی پیش کشی انتخاب کے ضیعفہ میں نہیں آتی اور یہ ترتیب کے اصولوں کے مغاثر ہے اس لیے تذکرہ نگار پر لازم ہے کہ وہ غیر جانب داری سے انتخاب کے تقاضہ کو پورا کرے۔

فنی تذکرہ کا ساتواں تقاضہ تذکرہ کے اسلوب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کے ذریعہ تذکرہ نگار وقائع نویسی، رنگین بیانی اور عبارت آرائی سے پرہیز کرتے ہوئے سادگی اور پرکاری کے دلکش انداز تحریر سے تذکرہ کو مزین کرتا ہے۔ تذکرہ کے اسلوب کیلئے لازمی ہے کہ ایسا انداز اختیار کیا جائے جو نہ صرف واضح ہو بلکہ دل چسپی برقرار رکھنے کا سبب بھی بنے تمام کامیاب ادبی اور مذہبی تذکرے ان خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ان کا مرتبہ کافی بلند ہے۔ تذکرہ میں اسلوب کے دو شان زدہ بیان نہ صرف فنی طور پر تذکرہ کو غیر معیاری بناتی ہے بلکہ اس کے ذریعہ تذکرہ کے تقاضہ کی تکمیل بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دقیق قسم کے تذکرے اپنی ثقالت کی وجہ سے اردو ادب میں غیر مہر دف ہو گئے۔ جن تذکرہ دل میں ان سات اہم ضروں کی تکمیل نظر آتی ہے وہ فنی طور پر تذکرہ کے حصن میں شمار کیے جائیں گے۔

کسی زبان میں ادب کے آغاز کے ساتھ ہی اس کی اصنافِ نثر میں پیش کردہ متن پر مباحث کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔

تذکرہ کا لزوم

چنانچہ تاریخ، سیرت، وقائع اور توذک یہ ایسے متبادل الفاظ رہے ہیں۔ جن کے بارے میں طویل بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ عام طور پر سیرت، وقائع اور توذک کو ایک ہی سلسلے کی کڑی سمجھا جاتا ہے۔ اس پس منظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس تحریر پر تذکرہ کا اطلاق ہوا اس کے

علاوہ کیا صرف ادبی طور پر تحریر کردہ سوانحی کتابوں کو تذکرہ کہا جائے گا۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن پر بحث ضروری ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ کن کتابوں پر تذکرہ کا فیصلہ صادر کیا جائے گا۔ بعض ناقدین نے صرف ادبی تذکروں کو "فن تذکرہ" کے ضمن میں شامل کیا ہے اور بعض ناقدین مذہبی تذکروں کو ادب میں شامل نہیں کرتے۔ ان حقائق کی روشنی میں لازمی ہے کہ ان خصوصیات کا جائزہ لیا جائے جنہیں بنیاد بنا کر کسی کتاب کو تذکرہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ عام طور پر ایسی تمام تحریری تذکرہ کے ضمن میں آئیں گی۔ جن میں ایک سے زائد شخصیات کے حالات اور کارنامے اکٹھا کر کے کتابی شکل میں جمع کر دیئے گئے ہوں۔ اس عمل کے لیے لازمی نہیں کہ وہ شخصیتیں صرف ادبی حیثیت کی حامل ہوں بلکہ مذہبی، سیاسی، سماجی، ثقافتی غرض ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے متعدد افراد کے حالات اور کارنامے کسی ایک کتاب میں جمع کر دینا "تذکرہ" کہلاتا ہے۔ اس تعریف سے تذکرہ کی حیثیت واضح ہو گئی۔ چنانچہ ایسی تمام کتابیں تذکرہ کے ضمن میں آئیں گی جو کسی ایک فن میں ماہر متعدد شخصیتوں کے حالات اور کارناموں کو اپنے طامن میں جگہ دیتی ہیں۔

کسی تحقیقی کتاب میں متعدد شخصیتوں کا ذکر ہو اور ان کے حالات اور کارنامے بھی پیش کیے جائیں تو اسے تذکرہ کے ضمن میں شامل نہیں کیا جائے گا کیونکہ تذکرہ کا لازم ایسی کتابوں پر ہوتا ہے۔ جن میں حالات اور کارنامے بیان کرنے کے دوران غیر معتبر ماخذات اور مشکوک مواد درج کیا جائے۔ چونکہ تحقیقی کتابوں میں معتبر ماخذات اور جامع مواد موجود ہوتا ہے اسی لیے ان کا شمار تذکرہ میں نہیں کیا جاسکتا۔ اس عملی ثبوت سے اندازہ ہوتا ہے کہ متعدد شخصیتوں کے بارے میں سوانحی مواد پیش کرنے والی ہر کتاب پر تذکرہ کا لازم نہیں ہوتا بلکہ ایسی کتابیں ہی تذکرہ کے ضمن میں آئیں گی جن میں حالات اور واقعات کی پیش کشی کے دوران تحقیقی

انداز روانہ رکھا جائے بلکہ تاریخ ادب و مذہب کی ترتیب کی عرض سے کچھ اہم ادبی و مذہبی شخصیتوں کے حالات یکجا کر دیئے جائیں اس میں منظر میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تذکرہ نگاری کے دوران مواد کی فراہمی کو ادبی و مذہبی نہیں دیا جاتا اور نہ ہی شخصیت کے حالات جمع کرنے کے لیے کد و کاوش کی جاتی ہے بلکہ ذیلی طور پر علم میں آنے والے حالات و واقعات ہی کو مرتب کر کے اسے تذکرہ کی شکل دے دی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے تذکرہ میں جامع مواد کا نہ ہونا اس کی خصوصیات میں شامل ہے فنی طور پر تذکرہ کا اطلاق ان کتابوں پر بھی ہو گا جو کئی شخصیات کے حالات بیان کرنے کی بجائے صرف شخصیتوں کی تاریخ پیدائش اور وفات درج کرنے کے بعد صرف ان کے کارنامے بیان کرنے پر اکتفا کرتی ہوں اگرچہ ان تذکرہ دل میں شخصی حالات درج نہیں ہوتے لیکن صرف اس بنیاد پر تذکرہ دل کے فن میں شامل ہیں کہ ان کی وجہ سے کسی عہد میں موجود مختلف فنون میں ماہر شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں کا علم ہوتا ہے۔ عام طور پر ان میں ایسے متعدد تذکرے لکھے گئے جو میں صرف مذہبی شخصیتوں کے نام، تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور تاریخ عرس وغیرہ درج ہیں۔ چونکہ یہ کتابیں دور جدید میں علماء، صوفیاء، اولیاء اور شعراء کی تاریخ ترتیب دینے میں مدد دیتی ہیں۔ اسی لیے ان پر بھی تذکرہ کا لازم ہوتا ہے۔

شاعروں اور ادبی کارکنوں کے انجام دینے والے اشخاص کے حالات اکٹھا کر دینا، تذکرہ میں شامل نہیں بلکہ فنی تذکرہ کا اطلاق ان تمام ادبی، مذہبی اور دیگر شعبہ بنیاد کے کارکنوں کی تفصیلات جمع کرنے والی کتابوں پر بھی ہو گا جو مستقبل میں تاریخ کی ترتیب میں مدد دیتی ہوں۔ اس لحاظ سے تذکرہ کا لازم صرف ادبی سوانح پر مشتمل کرنے والی کتابوں پر نہیں ہو گا بلکہ زندگی کے تمام طبقے اور شعبہ حیات سے متعلق افراد کے

حالات اور کارناموں کو کتابی شکل میں ترتیب دینا تذکرہ کہلاتے گا جس میں تحقیقی عمل کا مفہوم نہ ہوا۔ تدوینِ متن کے دوران روادری سے کام لیا گیا ہو۔ غرض تذکرہ ایک ایسا عمل ہے جو بذاتِ خود ترتیب کا کام انجام دینے کے ساتھ ساتھ مستقبل میں تحقیقی ترتیب کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتا ہے۔ تذکرہ عملی طور پر سوانح نہیں اور نہ ہی تاریخ ہے۔ اس کا شمار دقائق اور قووک میں بھی نہیں ہوتا بلکہ تذکرہ کو انتخابی سوانح کا نام دیا جاسکتا ہے اور ایسی تمام کتابیں جو شخصی حالات اور کارنامے ترتیب دینے کا حق ادا کرتی ہیں۔ فقاً احتساب سے تذکرہ کے ضمن میں آتی ہیں۔

تذکرہ کی جدیدیات | ادبی تحریروں میں تذکرہ ترتیب یا انتخاب کے عمل کی ناسندگی کرنے کی وجہ سے ایک فن کا درجہ رکھتا ہے لیکن تذکروں کے مطالعہ کے بعد ناقدین اور محققین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تذکرہ کو تخلیق کا درجہ دیں یا تالیف کی حیثیت سے اس کا مرتبہ متعین کریں۔ عموماً ہر تذکرہ میں اس کے مزاج، موضوع اور مواد پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اور ہر تذکرہ نگار اپنے قلم کے ذریعہ موزوں شخصیت کے ادبی مزاج یا پھر اس کی مذہبی کارکردگی کے ساتھ ساتھ سوانح بھی پیش کرتا ہے۔ تذکرہ کے ان عوامل کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ ایک انتخابی عمل اور ترتیب کی خصوصیت رکھتا ہے۔ درحقیقت ترتیب کا عمل تالیف کا درجہ رکھتا ہے۔ تذکرہ کی حیثیت تصنیف کی نہیں اور نہ ہی اسے غیر تخلیقی کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ تذکرہ نگار صاحبِ شخصیت کی سوانح اور کارنامے بیان کرنے کے دوران تخلیقی عمل کا سہارا لیتا ہے اور بغیر اس تخلیقی قوت کے تذکرہ کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس لیے تذکرہ تالیفی خصوصیت کا متحن ہونے کے باوجود تخلیقی خصوصیت کا بھی حامل ہے جس کے نتیجے میں تذکرہ ایک ایسی صنفِ سترار پاتا ہے جس میں تصنیف و تالیف کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ تخلیق کے عوامل بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔

مواد کے اعتبار سے تذکرہ کا مزاج سوانحی ہے یعنی تذکرہ میں شاعر کا صوفی کے حالات بیان کرنے کے دوران سوانحی خط و خال کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور تذکرہ نگار اپنی تحریر کی جولانی سے سوانحی مواد میں تخلیق کی خصوصیت کو اس طرح شامل کرتا ہے کہ تذکرہ میں ایک سے زائد شخصیات کی سوانح ہونے کے باوجود ترتیب کے دائرہ سے علیحدگی اختیار کر کے تالیف کے صیغہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر کسی بھی موضوع یا عنوان پر متن کی ترتیب کا عمل "تالیف" کے شعبہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور یہ عمل انتخاب کی خصوصیت سے مزین ہونے کی وجہ سے تالیف ہونے کی عام صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ یعنی کوئی بھی کتاب جس میں ترتیب اور انتخاب کا عمل کارفرما ہوگا اسے تالیف کا درجہ دیا جائے گا۔ لیکن تذکرہ میں شعراء کے حالات کی ترتیب اور ان کے کلام کا انتخاب ہونے کے باوجود اس کا شمار ترتیب میں نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ترتیب میں متعدد اشخاص کے منتخب موضوعات کو جگہ نہیں دی جاتی جبکہ تذکرہ میں منتخب موضوعات کا نہ صرف عمل دخل ہوتا ہے بلکہ متعدد شعراء کے حالات اکٹھا کر کے تذکرہ نگار انہیں اپنی تخلیقی صلاحیت کے ذریعہ کتابی شکل میں ترتیب دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرہ میں ترتیب و انتخاب کا عمل کارفرما ہونے کے باوجود اسے تخلیق کا درجہ حاصل ہے۔

فنی اعتبار سے تذکرہ کی جدلیاتی حیثیت ایک تخلیقی عمل کہلاتے ہیں کیونکہ جب تک تذکرہ نگار کے ذہن میں شاعروں کی زندگی یا صوفیاء کی اولیاء کی کرامات کا خاکہ نہیں ہوگا اس وقت تک تذکرہ کی تحریر کا عمل بے سود رہے گا اور تذکرہ نگار لاکھ چاہے ہوئے بھی کتاب تحریر نہ کر سکے گا جبکہ ترتیب کے دوران ذہن میں کسی قسم کا خاکہ مرتب کیے بغیر چند موضوعات کو اکٹھا کر کے کتابی شکل دی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ترتیب کے لیے چند کتابوں کے اقتباسات کا سہارا لیا جاتا ہے جبکہ تذکرہ نگاری کے دوران

اقتباسات سے مدد تو لی جاسکتی ہے۔ لیکن ان پر مکمل تکیہ نہیں کیا جاتا بلکہ تذکرہ نگار چند اہم کتابوں سے شخصیت کے سوانحی حالات اپنے ذہن میں محفوظ کر کے انہیں اپنے تخلیقی سرچشمہ کی بنیاد پر مرتب کرتا اور تحریر کی زد میں لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرہ میں ترتیب کی خصوصیت ہونے کے باوجود یہ تخلیقی سرچشمہ کامنا سدا ہے۔

علم مواد اور اسلوب کی بنیادوں پر تذکرہ کی حیثیت تالیف کی ہے تذکرہ میں سوانحی حالات اور انتخاب کلام کے سوا کچھ نہیں۔ جس کے ساتھ ہی تذکرہ نگار کو اپنے اسلوب کے جوہر دکھانے کے بہت کم مواقع ہیں۔ نیز اردو کے اکثر تذکروں میں شاعری یا صوفی کی شخصیت کے بارے میں متن کی حیثیت ذیل میں آتی ہے۔ یعنی تذکرہ نگار سوانحی خاکے نہیں بناتا بلکہ شخصیت کی زندگی کے حالات کے چند اہم کارنامے ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ جس میں اسلوب کی تلاش اداس کی منفرد مزاجی کو ٹٹولنا ایک مشکل امر ہے کیونکہ تذکرہ نگار شخصی حالات کے دوران ایجاز و اختصار سے کام لیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تذکرہ میں اکثر شخصیت کو حالات کی لمبیٹ میں بنایا جاتا ہے جو تخلیقی کارنامے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ایسا فعل ترتیب میں اختیار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ تالیف کے انتخاب اور ترتیب کے دوران مؤلف کو اپنے قلم کی جادو نگاری دکھانے کا موقع نہیں ملتا اور تذکرہ میں چونکہ تذکرہ نگار کو اپنے تخلیق کے گوشوں کو واضح کرنے کی پوری سہولت دی جاتی ہے اور تذکرہ نگار اسے اپنی مرضی کے موافق استعمال کرتا ہے۔ اسی لیے تذکرہ فنی طور پر تخلیق کا درجہ رکھتا ہے اور اس فن میں ترتیب اور انتخاب کی خصوصیت ہونے کی وجہ سے یہ مکمل تالیف ہونے کی دلالت کرتا ہے۔

فن اور فن کی جانچ کے پس منظر میں جب تنقیدی رویہ تذکرہ کا معیار اختیار کیا جاتا ہے۔ تو سب سے پہلے فن کے معیار سے بحث کی جاتی ہے۔

اجلی طور پر تذکرہ ایک فن اور تخلیقی صلاحیت قرار دیئے جانے کے بعد اس کے معیار اور مسائل پر بحث بھی لازمی ہے۔ ناقدین اُردو، ادبی طور پر کسی ایک تذکرہ کو اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں جبکہ دوسرا تذکرہ ان کی نگاہوں میں جچنے نہیں پاتا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک تذکرہ کا معیار نہ دیکھا جائے اس کی حیثیت اور مرتبہ کا تعین مشکل ہو جاتا ہے۔ فنی طور پر ہر تذکرہ اپنا معیار رکھتا ہے اور اپنے مخصوص مزاج اور ماحول کے ساتھ عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔ فن اور معیار کے پس منظر میں تذکرہ تخلیقی سرچشموں تصنیف، تالیف اور ترتیب جیسی خصوصیات میں تالیف کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک عمدہ تالیف کی حیثیت سے تذکرہ کا معیار متعین کرنا اجنبی جائزے کے مترادف ہے!

ادبی، سیاسی اور مذہبی طرز و انداز کے نامزد تذکروں کا معیار مختلف کی جڑ پر منحصر ہوتا ہے۔ تذکرہ کے معیار کو جانچنے کے لیے بیانی، معنی اور ترتیب کے طریقہ کار سے بحث کی جاتی ہے۔ جس تذکرہ میں بہترین بیان، جامع معنی کے ساتھ ترتیب کا انوکھا انداز اور رکھا جائے وہ فنی طور پر معیاری تذکرہ قرار پائے گا۔ ان اصولوں سے کمتر درجہ کے تمام تذکرے اگرچہ فنی لوازمات کی پابجائی کریں گے۔ لیکن معیاری نہیں قرار دیئے جاسکتے۔ ہر دور میں متعدد تذکرے لکھے گئے لیکن ان تمام تذکروں میں انفرادی حیثیت کا حامل تذکرہ ہی معیاری قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جس تذکرہ نگار نے اصولی تدوین کو پوری طرح سلوک میں لایا وہی کامیاب تذکرہ نگار قرار دیا گیا اور اس کا تالیف کردہ تذکرہ فنی اور ادبی طور پر معیاری تذکرہ کے ضمن میں شمار کیا گیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ نامزد تذکرے فنی معیار کے متقاضی ہوتے ہیں اور جن تذکروں میں اس معیار کی پابجائی نہیں ہوتی۔ وہ تذکرے کے فنی معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ تذکرہ کے معیار سے مراد اس فن کو بلند ی پر پہنچانے کے لیے اختیار کردہ وہ عملی ہے جو تذکرہ کے دوران اختیار کیا جاتا ہے۔ عام طور پر فن کی اصولی ترتیب ہر تذکرہ میں پائی جاتی ہے۔

ادب پر تذکرہ اسی مقصد کے تحت لکھا جاتا ہے کہ اس میں تذکرہ کے فن کے تمام اصولوں کو بروئے کار لایا جائے۔ لیکن بہت کم تذکرے ایسے ہوتے ہیں جو اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ فنی طور پر تذکرہ کا تمام اصولوں کی پابجائی کرنا تذکرہ کا معیار کہلائے گا۔ اور اسی معیار کی بدولت تذکرہ کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ چونکہ تذکرہ تصنیف اور ترتیب سے ہنگر تخلیقی سرچشمے تالیف سے متعلق ہے۔ اسی لیے اس کے معیار کی جانچ کے لیے تالیفی اصولوں کو رد کر دیا جاتا ہے۔ جس تذکرہ میں ترتیب کا بہترین طریقہ جامع سوانحی مواد اور محوزوں زبان و بیان کا سہارا لیا جائے۔ وہ نہ صرف معیاری تذکرہ کہلائے گا بلکہ اس کی درجہ سے ادب میں بھی اضافہ ہوگا۔

تذکرہ کے فنی جائزے میں جہاں اس کے فن سے معلومات حاصل کی جاتی ہیں وہیں تذکرہ کے تعاضے کے علاوہ تذکرہ کے اطلاق اور اس کی جدلیاتی حیثیت سے بھی بحث کی جاتی ہے۔ جب ان تمام خصوصیتوں کی بھلک تذکرہ میں موجود ہوگی تو معیاری طور پر اس تذکرہ کا مرتبہ بلند ہوگا۔ اور فنی اعتبار سے تذکرہ کی ہیئت بھی سامنے آئے گی۔

ہیئت اعتبار سے ادب کی تمام اصناف تخلیقی رجحان کی ترجمان بنتی

ادب میں تذکرہ کا مرتبہ

ہیں۔ داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ اور شاعری کے تمام اصناف تخلیقی سرچشمے ہیں۔ ان کے برخلاف سوانح، تذکرہ، سفرنامہ اور آپ بیتی کا شملہ تالیف میں ہوتا ہے۔ ادبی طور پر تذکرہ کی حیثیت ایک مکمل تالیف کی ہے جس میں ب اوقات تذکرہ نگار اپنی جدت طبع سے تصنیف کی خصوصیت لانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ترتیب اور انتخاب کے متن کی کثرت کی وجہ سے تذکرہ کو ادبی طور پر تصنیف کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ تذکرہ میں تالیفی خصوصیات پوری طرح موجود ہوتی ہیں۔ سوانح کا بیان اور تذکرہ نگار کا اسلوب اگرچہ تذکرہ کو تصنیف کے قریب کرتے ہیں لیکن تاریخ اور سنین کے ساتھ ہر سال کے واقعات

اور زندگی کے اہم کارناموں کو پیش کرنے کے دوران تذکرہ نگار، انشا پردازی کے جوہر بھی دکھاتا ہے۔ یہ انداز تذکرہ کو تصنیف سے قربت بخشتا ہے۔ لیکن ترتیب و تدوین کے علاوہ تذکرہ کا بیشتر حصہ انتخاب سے متعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں تذکرہ کا مرتبہ تالیف کی حیثیت سے نمایاں ہے۔

فنی اعتبار سے تذکرہ نگاری ایک مجتمع اور مرکب صنف ہے جس میں انتخاب کی صلاحیت بھی موجود ہے اور ترتیب کا سلیقہ بھی جس کے ساتھ ہی انشا پردازی کا اسلوب کے جوہر بھی تذکرہ کی صنف میں شامل ہیں۔ سوانحی مواد اور تاریخی جائزہ بھی تذکرہ کی صنف کا ایک جز ہے ان بنیادی خصوصیات کی بنیاد پر تذکرہ ادب کی ایک صنف ہونے کے علاوہ شخصیت کی ہمہ گیر کو کتابی شکل میں پیش کرنے کا دعویدار بھی ہے۔ اگرچہ شخصیت کے حالات پیش کرنے میں ابھارا و اختصار کی وجہ سے شخصیت کے بعض گوشے پنہاں رہ جاتے ہیں۔ لیکن اس نقص کے باوجود بھی تذکرہ ادبی طور پر ایک صنف کا مرتبہ رکھتا ہے اور یہ ایسی فعال صنف ہے کہ جس کی وجہ سے تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اور ہمہ قدیم میں شعر گوئی اور شاعرانہ چشمک کے علاوہ مشاعروں کی روایت کے بارے میں بھی تذکروں سے ہی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں تذکرہ کا مرتبہ ایک صنف اور تالیف کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے جس کے ساتھ ہی افادیت کی بنیادوں پر تذکرہ فنی طور پر ادبی تاریخ یا مذہبی تاریخ مدعیٰ کوئے کا بہترین اور معتبر ذریعہ بھی ہے۔

ایب ووم

تذکرہ نگاری کے اقسام

تذکرہ تحریر کرنے کی خصوصیات میں مختلف اسلوب عروج ہیں۔ ان میں طرز تحریر کے لحاظ سے جمیدہ جمیدہ فرق بھی پایا جاسکے۔ اگرچہ یہ تمام اسلوبات مکمل طور پر سوانح کے فن سے وابستہ ہیں لیکن ان کی تحریروں کے انداز میں فسق اور اصول کی تبدیلی کی وجہ سے انہیں مختلف عنوانات سے مربوط کیا گیا ہے۔ تذکرہ نگاری کا مقصدی پہلو سوانح کی سربراہدہ اشخاص کی زندگی اور حالات کے علاوہ کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی سوانح پیش کرتا رہا۔ لیکن اصول پسندی اور شعوری ارتقاء تکمیلی حیثیت میں نہ ہونے کی وجہ سے سوانح نگاری روایتی طور پر تذکرہ کے روپ میں ترقی کرتی رہی اور یہی تذکرہ کا فن مختلف انداز سے اسلوب کو بدلتا ہوا متفرق عنوانات کا حامل رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ”اردو تذکرہ نگاری“ کا تحقیقی و تاریخی جائزہ لیا جائے تو یہ فنی طور پر مختلف اقسام میں تبدیل ہو کر اپنے اسلوب کی علاوہ خصوصیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ تذکرہ نگاری ایک ضمنی صنف کا درجہ رکھتی ہے۔ جس کی جدید ترقی یافتہ شکل سوانح نگاری آج کے ادبیات کی مقبول ترین صنف ہے۔ تذکرہ تحریر کرتے ہوئے اردو کے سوانحی ادب کے معیاروں نے علموہ علموہ انداز اور مختلف طرز تحریر کو رد کر رکھا۔ یہاں تک کہ یہ جداگانہ اسلوب عنوانات کے اعتبار سے منفرد طرز نگارش کا علمبردار قرار پایا۔ اردو تذکرہ نگاری کی ابتداء اور ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ تذکرہ کا فن اگرچہ

ابتدائی طور پر شخصیات و حالات کے ذکر کے لیے مختص رہا لیکن رفتہ رفتہ اس طرز تحریر میں نمایاں فرق محسوس کیا جانے لگا اور پھر تذکرہ نگاری کی مختلف اقسام اور متبادل اسلوب سے وابستہ ہو گئی۔

تذکرہ کافن صاحب شخصیت کی زندگی کے حالات اور کارناموں کے پیش کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جس میں تحقیقی اور راستہ لاری اصول کی کمیابی بری طرح کھٹکتی ہے۔ اور جب یہی تذکرہ شخصیت کے کارناموں اور حالات کو پیش کرتے ہوئے تحقیقی اور حقائق پسندانہ طرز نگارش سے قربت حاصل کرتا ہے تو سوانح حیات کو BIOGRAPHY کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب سوانح حیات کی تحریر میں خود کی زندگی کا عکس ذاتی قلم سے رونما ہو تو ایسی تحریر "خودنوشت سوانح" یا AUTOBIOGRAPHY کہلاتی ہے۔ جس میں ایک شخص اپنے حالات زندگی اپنے قلم سے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے۔ اگر اس فن تحریر میں حافظہ پر زور دے کر بجھری یا دوں کو سوانحی شکل دی جائے تو یہ انداز یادداشت نگاری (REMINISCENCE) کہلاتا ہے۔ عام طور پر بزرگوار حالات تحریر کر کے اسے مبسوط کتاب کی شکل دے دی جائے تو یہ انداز روزنامہ DIARY کہلائے گا۔ انسان کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے مسفر کی دشواریوں اور حالات سفر کا ذکر کسی تحریر کی خصوصیت قرار پائے تو اس انداز کو سفرنامہ TRAVELOGUE کہا جائے گا۔ قدیم تحریروں میں کسی فرد کا ذکر یا فنی طور پر کسی اہم واقعہ کی جانب اشارہ ہو تو یہ انداز محفوظ نگاری GOSPELS کہلاتا ہے۔ اسی طرح انسانی اپنے عمر و حالات کا ذکر کسی کے ردیر و کرے تو اس طرز و انداز کو سرگزشت کہا جائے گا۔ اس طرح تذکرہ نگاری کافی ساٹ مختلف انداز تحریر کا نمائندہ ہے۔ جس کو فن اور اصول کی روشنی میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ سوانح نگاری BIOGRAPHY

AUTO BIOGRAPHY

۲۔ خودنوشت سوانح نگاری

(REMINISCENCE)

۳۔ یادداشت نگاری

(DIARY)

۴۔ روزنامہ

TRAVELOGUE

۵۔ سفرنامہ

GOSPELS

۶۔ موقوفات نگاری

UTTERANCE

۷۔ سرگزشت

انسان کی زندگی کا جائزہ تاریخ اور عہد کی روشنی میں پیش کرنا ادبی بنیادوں پر خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ عام طور پر جب

سوانح نگاری

کسی انسان کی زندگی کو بحث کا موضوع بناتے ہوئے انسانی زندگی کے اہم مواد کو بیانی شکل دی جاتے تو یہ اظہار ادب میں "سوانح نگاری" کہلاتا ہے۔ سوانح نگاری نہ صرف ایک مکمل صنف ہے بلکہ دور جدید کی سب سے کامیاب طرز تحریر کا درجہ رکھتی ہے۔ ادبی طور پر اردو نثر میں سوانح نگاری کا سلسلہ تذکرے سے جاملتا ہے یعنی اردو ادب میں سب سے پہلے انسان کی زندگی اور اس کے حالات کو تحریری روپ دینے کے لیے تذکرہ نگاری کا رواج ہوا۔ اس لحاظ سے سوانح نگاری اردو تذکرہ کی ترقی یافتہ اور قابل قبول صنف ہے جس نے نہ صرف تذکرہ کی قدامت کو موہوم کر دیا بلکہ اپنے پس منظر میں تحقیقی مواد اور سائنسی استدلال رکھنے کی وجہ سے اردو میں تذکرہ نگاری کی صنف محدود ہونے لگی اور سوانح نگاری نے عام شہرت حاصل کر لی۔ لیکن اردو کا نقادان حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اردو ادب کی قدیم صنف تذکرہ کو جدید لوازمات سے آراستہ کر کے اُسے دور جدید میں سوانح نگاری کے فن سے موسوم کیا جانے لگا۔ اس اعتبار سے سوانح نگاری بنیادی طور پر تذکرے کے فن سے استفادہ کرتی اور اسی فن کی ایک مستبدہ صنف ہونے کا درجہ رکھتی ہے۔

سوانح نگاری کسی شخصیت کی داستانِ حیات کو قلمبند کرنے کا ایک

ایسا طریقہ ہے جس میں پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات کو مبسوط شکل دے کر زمانے کے تغیرات، معاشرے کی ذریعوں حافی اور رسم و رواج کے رد و بدل کا شخصیت پر اثر بتایا جاتا ہے یا پھر شخصیت کی وجہ سے زمانہ میں رونما ہونے والے تغیرات کو تاریخ اور عہد کے ساتھ بیان کرنا سوانح نگاری کہلاتا ہے یعنی اس فن کے ذریعہ ایک انسان کی زندگی کو دور اور عہد کے بندھنوں میں باندھ کر شخصیت کے زمانہ، پر تغیرات اور انقلابات کے شخصیت پر اثرات سے بحث کی جاتی ہے۔ اور انسانی حیات کو قابل قبول بنانے کے لیے شخصیت کے اخلاق و کردار کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے سوانح نگاری ایک ایسی صنفِ نثر ہے جس کے ذریعہ شخصیت کی حیات کو تحریری شکل دی جا کر اس کی زندگی کے قیمتی واقعات کو اصول پسند زندگی کا مظہر بتایا جاتا ہے۔ سوانح عمری اسی وجہ سے قیمتی صنفِ سخن ہے کہ اس کے ذریعہ تاریخ، شخصیت، کردار، سیرت اور فطرت کی بھرپور نمائندگی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ جدید میں سوانح نگاری کے فن کو انسانی حیات کی پیش کش کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ فنِ سوانح نگاری کے بارے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ اس فن کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

”سوانح عمری تاریخ کی وہ شکل ہے جو انسانی نسلوں اور گروہوں سے نہیں بلکہ افراد سے متعلق ہے یا یہ کہ سوانح عمری ایک انسان کی پیدائش سے موت تک کے افکار و افعال کا بیان ہے یعنی حقائق کے ساتھ کردار اور ذہن کی نشوونما کا مرقع ہے۔ انسان کی شخصیت کی تصویر ہے اور داخلی احساسات کی کہانی ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کی تعریف یہ ہے کہ سوانح عمری بطور ایک ادبی صنف کے افراد کی زندگی کی تاریخ ہے کہ اس میں تین لوازم تاریخ، فرد اور ادب بتائے گئے ہیں۔“

کارلائل کے نزدیک "سوانح عمری ایک انسان کی حیات ہے اسی طرح ایک اور تعریف میں کہا گیا ہے کہ "سوانح عمری ایک انسان کی تاریخ ہے" ان تعریفات سے پتہ چلتا ہے کہ سوانح نگاری بنیادی طور پر کچھ اصولوں کی پابند اور نظریاتی قیود کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ فن مذہبی، اخلاقی، تاریخی اور سائنسی سوانح عمریوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

سوانح نگاری کا موضوع غیر معمولی قوت اظہار اور عظمت کا متلاشی ہوتا ہے یعنی سوانح نگاری نہ صرف موضوع کے اعتبار سے غیر معمولی اظہار کی قوت کو نکلتی ہے بلکہ شخصیت کے مضامین اور شخصیت کی عظمت کو بھی بحث کا موضوع بناتی ہے اسی لیے سوانح نگاری کو عظیم شخصیتوں کے موضوع گردار و کارنامے کا مرکب کہا جاتا ہے جس میں آنے والی نسلوں کی دلچسپی کو متحرک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس تحریک کی صلاحیت کو واضح کرنے کے لیے فن سوانح نگاری کا مل طور پر موضوع، مواد اور بیان کی ضرورت کی مثلاًشی ہوتی ہے۔

اس فن میں صرف عظیم شخصیت کی جسامت کو موضوع بحث نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ لطیف و نازک احساسات، ہمدردانہ جذبات، زندگی کی پر معنی مسرت اور عملی زندگی میں پیش آنے والی مشکلات اور جدوجہد کا ذکر بھی کیا جاتا ہے مجموعی اعتبار سے سوانح عمری عوامی زندگی اور بنی تعلقات کو پیش کرنے والی ایک ایسی تحریر ہے جس میں شخصیت کے حالات اور اس کی زندگی میں پیش آنے والے تمام واقعات کو کتبائی شکل دی جاتی ہے۔ اسی لیے سوانح عمری کو "از جھولا تا ڈولا" تمام اہم واقعات کو پیش کرنے کا فخر حاصل ہے۔ اس طرح سوانح عمری کا فن شخص کی زندگی کی ابتدا سے آغاز کے مراحل طے کرتا ہوا اس کی موت پر اختتامی درجہ کو پہنچتا ہے۔ اس فن میں شخصیت کی حیات کو پیش کرنے والا اپنی تحریر اور اپنے منفرد اسلوب سے فن کو مکمل طور پر ادبی بنا دیتا ہے یعنی سوانح نگاری کے فن میں صرف عظیم شخصیت کی زندگی اور کارناموں ہی کو اہمیت حاصل

نہیں ہے بلکہ تخلیق کار کی فنی صلاحیت کو بھی خاص دخل ہوتا ہے۔ اس فن میں سوانح نگار جس قدر انفرادی ذہنیت کا حامل ہوگا اسی قدر کامیابی کے ساتھ اپنے فن میں نکھار پیدا کر سکے گا۔ اس لحاظ سے سوانح نگاری شخصیت کے کارناموں اور ان کی خدمات کا ایسا ایسا اعتراف ہے کہ جس میں شخصیت کی حیات تحریر کرنے والا اپنی زبان دانی کی خصوصیت کو بھرپور صلاحیتوں سے اس فن کی زمینت بناتا اور اس کی خدمات کا اعتراف کرتا ہے اس طرح فن سوانح نگاری ایک فنکار کے قلم سے نکلی ہوئی ایسی موزوں تحریر ہے جس میں عظیم شخصیت کے حالات پیدائش سے لے کر موت تک کے ماحول میں رقم کیے جاتے اور زمانے و عہد کے پس منظر میں اس کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ سوانح لکھنے کے بارے میں شخصیت کے انتخاب کو ضروری قرار دیتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

”حیاتیں جو لکھی جانی چاہئیں وہ ہیں جن کے بارے میں دنیا نے نہ کبھی سنا

ہے نہ سوچا ہے جو پھر بھی اس کا سب سے زیادہ کام کر رہی ہیں اور جن

سے ہم سیکھ سکتے ہیں کہ کام کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔“

سوانح نگاری کے لیے عظیم شخصیت کے انتخاب سے مواد صرف عہد ہائے تہ بڑائی نہیں

ہے بلکہ ایسی شخصیتوں کو عظیم خیال کیا جائے گا جنہوں نے انسانیت کی فلاح کے لیے

کام کیا ہو۔ اور اپنی زندگی کے ذریعہ ایسی جہات اور ناقابل تسخیر مسائل کو حل کیا ہو جن سے

انسانیت کی فلاح ہوئی ہو۔ ایسی شخصیتیں عظمت کے قابل ہیں اور ان کی زندگی پر مبسوط کتاب

تحریر کرنا سوانح نگاری کے فرائض کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سوانح نگاری کے فن کے لیے

بڑی عظمت شخصیت کا انتخاب بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے کوئی ضروری نہیں کہ جس شخصیت پر

سوانح نگاری کا فن اس کی حیات اور کارناموں کو پیش کردہ وہ ساری دنیا کے لیے جاننا چاہیے
دنیا میں کم غہرت یافتہ انسانوں کی زندگی کے بارے میں سوانح نگاری کا فن اختیار کیا جاسکتا

انسان کی زندگی کا جائزہ اور حیات و حیات کا تذکرہ اس کے علاوہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے والی خوش حالی اور بد حالی کا ذکر سوانح عمری کے فن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ کارناموں کے ذکر کے علاوہ سوانح نگاری کے ذریعہ انسانی زندگی کی شخصی مرقع کاری اور شخصیت کے ہمہ جہتی پہلو کا جائزہ بھی سوانح عمری کے فن میں داخل ہے۔ سوانح حیات کی فنی خصوصیت کو واضح کرتے ہوئے انسائیکلو پیڈیا میں لکھا

A narrative which seeks, consciously and artistically, to record the action and recreate the personality of an individual life. Unlike history it deals with the individual, unlike fiction it records a life that actually has been lived. At the same time the biographer shares with the historian a concern for truth and he shares with the novelist the ambition to create a work of art. Thus the great biographies of the world are those which have presented their subjects as they were but which have gone beyond the more cold action of facts to the creation of a

living portrait. Biography is of perennial interest, partly because it deals with famous or notorious or interesting personalities, But more importantly because its subject matter is human nature. Hence biography is an art may legitimately deal with any individual life, no matter how humble provided it is made the vehicle for a penetrating analysis of human passions and human motive, it is in such biographies that Samuel Johnson saw the greatest value, those which tell not how any man because great, but how he was made happy, not how he lost the favour of his prince but how he became discontented with himself (Idler 84)^۱

شخصیت کی سچی اور حقائق کا انتخاب اور اس کے علاوہ زندہ کارناموں کی اہلیت رکھنے والے کردار کو خصوصی دل چسپی کے ساتھ ضبط تحریر میں لانا اور اس کی خصوصیات کی وضاحت کرنا فنِ سوانح نگاری کی تعریف میں داخل ہے اسی طرح سوانح حیات میں انفرادی خصوصیات اور شخصیت میں خوبیاں والی عالمانہ ذہنیت کے بیان کو بھی اس فن میں اہل کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سوانح نگار ایک وقت نہ صرف مورخ کی خصوصیات کو سوانح نگاری میں شامل کرتا ہے بلکہ ناول نگار کی طرح منفرد اسلوب کے ذریعہ سچی اور شخصیت کے اندر سر بستہ رازوں کو بھی افشا کرتا ہے۔ انسان جس طرح زندگی گزارتا ہے اسی انداز سے ضبط تحریر میں لانا سوانح نگاری کی اہم ضرورت ہے۔

سوانح حیات کے موضوع کے لیے ضروری نہیں ہے کہ صرف نا سحر اشخاص کی زندگی ہی کو تحریری نمونہ بنایا جائے بلکہ ان تمام شخصیات کی زندگی کو ضبط تحریر میں لایا جاسکتا ہے جو معزز ہوں یا بدنام۔ لیکن ان کی زندگی دلچسپ سے بھرپور ہے تو نہ صرف ان کی سوانح حیات لکھی جاسکتی ہے بلکہ اس فن کے ذریعہ ان کی زندگی کے واقعات کو بھی اچھا راجا جاسکتا ہے۔ سوانح نگاری کا مرکزی موضوع انسانی فطرت قرار پاتا ہے جس کے ذریعہ انسانی جذبات احساسات اور خیالات کی ترجمانی کے علاوہ شخصیت کا تجزیہ اور اس کی تحلیل و ترکیب بھی واضح کی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ سوانح نگاری کے ذریعہ خاکساری منکر المزاجی طبیعت کا گھنا دنیا بین اور اس کے جائز و ناجائز کارنامے بیان کرتے ہوئے شخصیت اور کردار کے علاوہ سیرت کی عکس کشی بھی کی جاتی ہے مجموعی اعتبار سے سوانح حیات کا فن شخصیت اور کردار کے علاوہ سیرت کے ارد گرد گھومت ہے۔ جس کے ذریعہ انسان کے کارنامے کو شخصی زندگی اور عوامی زندگی کا خاکہ

کہتے ہوئے زندگی کے مختلف روپ کو تحریر، طور پر پیدائش اور وفات کی بندھنوں میں جکڑ دیتا ہے جو نہ صرف انسانی اقدار کی نمائندگی کے علاوہ اخلاقی و روحانی معاملات کی عقدہ کشائی بھی کرتے ہیں اور اسی عمل کو فنی طور پر سوانح نگاری کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے سوانح نگاری اخلاقی، روحانی اور فطری اقدار کی پابند انسانی شخصیت، کردار اور سیرت کا ایک ایسا اظہار ہے جس میں انسانی شخصیت اور اس کے کارناموں کا ایک ایک عملی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایسی تحریر جو غیر فرد کے قلم سے نمودار ہو اور جس میں پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات درج ہوں اور جس کے ذریعہ شخصیت کا ہر پہلو واضح ہو جائے اور ایسے فن کو تحریری شکل دیدی جائے تو اسے سوانح نگاری کا نام دیا جائے گا۔

سوانح حیات کی تحریر کے لیے مواد کی فراہمی بھی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ صاحب شخصیت کی تحریروں، تقریروں اور تصانیف سے اس معاملہ میں کام لیا جاتا ہے۔ لیکن انہیں جمع کرنا ہی سوانح کا اصول نہیں قرار پاسکتا۔ بلکہ صاحب شخصیت کی دماغی کینیت آزدوئی، جلی اظہار اور احساس اس کے علاوہ سوانح سے متعلق بھی مواد فراہم کرنا سوانح نگاری کے اصول میں داخل ہے صرف شخصیت کی حیات لکھ لینا ہی سوانح عمری نہیں کہلاتی بلکہ زندگی کی کشمکش اور جذباتی اور غیر جذباتی رویے کے علاوہ انسانی قوت فیصلہ کے عمل کو بھی سوانح نگاری میں شامل کیا جاتا ہے۔ ان تمام معاملات کو ہمیش نظر رکھتے ہوئے سوانح حیات لکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوانح نگار کو بھونک بھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے اور جب تک کوئی شہادت موجود نہ ہو وہ اپنے قلم کو اپنی مرضی سے استعمال نہیں کر سکتا سوانح نگار کا اندازہ مورخ کی خصوصیات کے علاوہ ناول نگار کی جدت کو فنی سوانح نگاری میں شامل کرتا ہے جس کی وجہ سے سوانح نگاری ایک مستند تصنیفی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔

سوانح نگاری کی ضرورتیں اور اس فن کی تحریر کے لیے شرائط کے بارے میں مختلف مکاتب خیال پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سوانح عمری کسی شخصیت کا مختلف زاویوں سے جائزہ لینے کا عمل ہے جس کے ذریعہ شخصیت کو سماج میں ہیر و کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ سوانح عمری کی ضرورت کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

"سوانح نگاری کے لیے چند شرائط ضروری ہیں اول یہ کہ سوانح نگار اپنے فن سے پوری طرح واقف ہو دوسری یہ کہ سوانح نگار زمانہ کے بدلے ہوئے مذاق کے مطابق شخصیت کے ان عناصر پر زور دے جو قارئین کی نگاہ میں اہمیت رکھتے ہوں۔ تیسری یہ کہ سوانح نگاری کے ذریعہ شخصیت نگاری کا فن ترقی کر سکے۔ بظاہر یہ شرائط کچھ ایسی اہم معلوم نہیں ہوتیں۔ بعض لوگ تو بغیر کسی فنی آگاہی کے صرف اپنے جوہر قابل پر اعتماد کر کے سوانح نگاری کرتے آئے ہیں۔ لیکن ان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ نادانستہ طور پر وہ ان اصولوں پر کاربند رہے ہیں..... کسی ہیر و کا حال بیان کرنے میں یہ لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اس کے کاربائے نمایاں پر زور دیا جائے۔ اس کی زندگی کے ان لمحات کا حال تفصیل کے ساتھ بیان کرنا لا حاصل ہو گا جن میں وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں لگا رہا ہو یا ایسے غیر ضروری کاموں میں مصروف رہا ہو جن کے بیان سے قاری کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ جو لوگ خود اپنے حالات یا دوسروں کے سوانح ایک خاص نقطہ نظر سے بیان کرتے ہیں اور اس نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر اپنی یا دوسروں کی شخصیت کے خدو خال نمایاں کرتے ہیں وہ سوانح نگاری کے فن سے واقف ہوتے ہیں۔ سوانح نگاری ایک بڑی ذمہ دار صنفِ ادب ہے۔ جن میں شخصیتوں کی سوانح ماڈل یا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے پیش کیے

جائیں ان میں واقعی کوئی بات بھی ایسی ہونی چاہیے کہ پڑھنے والے کو احساس ہو کہ اس شخصیت کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ یہی شخصیتیں ہمارے سماج میں ہر وہ ہیں کہ ابھرتی ہیں۔ ان کا مسیہ انی علی خواہ سیاسی ہو یا مذہبی یا ادبی۔

مجموعی اعتبار سے سوانح نگاری کے ذریعہ شخصیت نگاری کا عروج ہوتا ہے۔ ادبی سوانح جس کے ذریعہ شخصیت کی غلطیاں اور کوتاہیاں بھی بیان کی جائیں ان سے قاری نہ صرف سامان عبرت و بصیرت حاصل کرتا ہے بلکہ ان خامیوں سے گریز برت کر اپنی زندگی کو کامرانی کے دھارے تک پہنچا سکتا ہے۔ اگر سوانح نگاری میں غلطیاں اور کوتاہیاں بیان نہ کی جائیں تو اس فن سے انصاف نہ ہو گا۔ سوانح نگار مصروف شخصیتوں کو ہیر دہن کر ان کی پرستش کرنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ صاحب شخصیت کی عظمت کو پوری طرح سمجھنا اور اس کی شخصیت کی خوبیاں اور خامیاں بیان کر کے قارئین میں کوتاہیوں اور بلندیوں کا پورا احساس دلانا ہی سوانح نگاری کے شرائط اور ضرورت میں داخل ہیں۔ اگر سوانح نگار اپنی تحریر کے ذریعہ قارئین میں خوبیاں اور خامیاں پر کھنکھانے کا شعور نہ پیدا کر سکے تو ایسی سوانح ناکام ترین قرار دی جائے گی۔

انسان کی خود بینی فطرت اور اپنی خوبیوں بیان

خود نوشت سوانح

کرنے کی صلاحیت ادب میں نئے اظہارات اور اسلوب کا ذریعہ بنتی ہے۔ چنانچہ حالات اور کیفیات کے پس منظر میں سیرت و شخصیت کے کامیاب ابلاغ اور شخصی زندگی ابھارتا خود نوشت سوانح کہلاتا ہے۔ درحقیقت خود نوشت سوانح عمری انسانی زندگی کے اعترافات کا بذات خود تحریر کردہ ایسا اعمال نامہ ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے حالات زندگی خود کے قلم سے تحریر کرتا اور اپنی زندگی کے واقعات کو سوانحی روپ دیتا ہے۔ خود نوشت سوانح عمری، شخصی اوصاف اور جذبات و احساسات

کہ جانی کا ایک یا خود ہے جس میں ایک انسان اپنی زندگی کی خصوصیات کا جب اسیر و پوری
صحت، ایمان داری، حمدگی، تجربے اور حساب کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ یعنی خود نوشت
سوانح عمری، انسان کی اپنی زندگی کی خوبیوں اور خامیوں کا ذاتی اظہار ہے۔

بیانی کے ذریعہ اپنی ذات اور خصوصیات کے بارے میں اظہارات اور خیالات کے
سوانحی روپ میں قلم برد کرنا خود نوشت سوانح عمری کی تعریف میں یعنی خود نوشت سوانح کے
ذریعہ انسان اپنی شخصی زندگی کے حالات کو تحریری شکل دے کر اپنے قلم سے اپنی زندگی
کے واقعات محفوظ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس سے نہ صرف مصنف کی علمیت کا
اظہار ہوتا ہے بلکہ انکشاف ذات کے علاوہ مصنف کے خرد و حال اور شخصیت کا
عکس پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ خود نوشت سوانح میں طرز بیان کے علاوہ ایک
خصوصیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ اس طریقہ اظہار میں پیدائش اور موت کے درمیانی
واقعات کو زندگی کا لازمہ تصور کر کے انھیں انکشاف ذات کی بنیادوں میں پابند کیا
جاتا ہے جو نہ صرف شخصیت کے وسیع مظاہر کا ذریعہ ہے بلکہ طرز و طریقہ کے
علاوہ ظاہری قیود کی پابندی میں شخصیت کی دل چسپی کی بہترین تحریک بھی ہے اس
اعتبار سے خود نوشت سوانح عمری خود پرورد اور آفاقی پسندی شخصیت کی حیات کا ایک
ایسا اظہار ہے جس کے ذریعہ زندگی کی نشوونما اور اس کی تربیت و نظم کا عکس نمایاں
ہوتا ہے۔ یعنی خود نوشت سوانح کے ذریعہ ایک انسان کی زندگی کے مکمل حالات مبسوطاً
شکل میں اس کی تحریر کے ذریعہ واضح ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے خود نوشت سوانح ایک
اہم ترین سوانحی دستاویز بن جاتی۔

اپنی نگاہوں کو اپنے آپ پر منعطف کر کے اپنی شخصیت کی مختلف حقیقتوں کو آشکار
کرنا خود نوشت سوانح عمری میں داخل ہے۔ دنیا کے تمام مسائل انسان کی ذات کے
متعلق ہوتے ہیں اور حالات کے پس منظر میں شخصی اظہار کا ذریعہ تلاش کرتے ہیں۔ ان تمام

اپنی زندگی کے اعتراف کے طور پر پیش کرنا "خودنوشت سوانح" ہے۔ اس خصوص میں ناقدین نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"آپ اپنی لکھنے والا کم سے کم مورخ کی پہلی شرط یعنی سچائی کے علم کو یاد کرتا ہے اور گو تصنع اور بناوٹ کا گمان ہو سکتا ہے لیکن ایک آپ اپنی لکھنے والے سے بھی غیر جانب داری کی اتنی ہی توقع کی جاسکتی ہے۔ جتنی کسی سوانح نگار سے..... وہ معلوم باتوں میں اپنے ضمیر کا گلا گھونٹے بغیر غلط بیانی نہیں کر سکتا۔ اس کا واحد مقصد خود پرستی ہو سکتا ہے۔ جسے چھپایا نہیں جاسکتا۔" ۱

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ خودنوشت سوانح عمری، انسان کی خود پرستی کے جذبے کی نشاندہ ہے۔ جس کے ذریعہ خودنوشت سوانح نگار سچائی کو پیش کرنے کی مکمل کوشش کرتا ہے۔ اور اپنے عمل سے غیر جانب داری بھی رد کر لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خودنوشت سوانح انسانی زندگی کی ذاتی تحریروں کا نتیجہ بن جاتی ہے۔ جس کے بارے میں جانسن لکھتا ہے:

"خودنوشت سوانح عمری ایک سخت دشوار اور قوت فیصلہ کو متزلزل کر دینے والی چیز ہے اور وہ ایمان داری، تجزیاتی نظر، خود آگاہی اور واقعت پسندانہ دیانت داری سے عاری ہو سکتا ہے۔ مزید برآں سب سے زیادہ عقلمند یا ایمان دار کے لیے بھی پورے داری، ترمیم و اضافہ یا مبالغے کے درجہ ہو سکتے ہیں۔" ۲

نفس انسانی بے ہنگم مقاصد بے ڈھنگی خواہشات، ہوجانات اور اشتہاؤں وغیرہ کا ایک عجیب سیال آتشیں اور جاندار مرکب ہے۔ جس کا ایک اگر ٹھوس بطون ہو بھی تو وہ سراب آسا اور سیما صفت ہے۔ جس کی ہر تہہ بیان کے چھلکے کی طرح موقتی طور پر آخری معلوم ہوتی ہے۔ جبکہ خود نوشت سوانح، زندگی کے مختلف ادوار کے حالات پیش کرنے کی نمائندہ ہے۔ انسانی فطرت کے مختلف گوشوں کی میاں حالت کو مربوط شکل دے کر اپنے دل کو آئینہ دکھانے کی ذمہ دار تسرار پاتی ہے۔ خود نوشت سوانح، ایک انسان کے واقعات زندگی کا بیان ہے جس کے ذریعہ انسان اہم ترین واقعات کا انتخاب کر کے حافظہ کی بنیاد پر انھیں تحریر کرتا ہے جس کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے۔

خود نوشت سوانح عمری میں بھی واقعات زندگی کا انتخاب ضروری ہے ورنہ اگر جیس جوائس کے مشہور تاریخی فرد نویس کی ایک دن کی مصروفیات کو فرضی پسیرائے میں بیان کے لیے آٹھ صفحات ناکافی ہیں تو کسی کی زندگی کے ہزاروں دنوں کے بیان کے لیے کتنے دفتر چاہئیں۔ اسپنسر نے اسی لیے صرف نمایاں حدود خال کے انتخاب کو مبالغہ آمیز جانتے ہوئے بھی ضروری تسرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ روزمرہ کے معمولی مشاغل کا خوف لازمی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے انسانی محسوسات، افکار، اقوال اور افعال ہنگامی ہوتے ہیں اور زندگی کے اصل دھارے پر ان سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔“ لہ

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود نوشت سوانح عمری میں روزمرہ

کے متاعل را فعال سے زیادہ زندگی کے اصل دھارے سے متعلق مواد کی ترقی پر توجہ دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے خود نوشت نواح عمری کے پلاٹ میں اتحاد پیدا ہوتا ہے اور یہ فن متحد اور مربوط شکل میں ادنیٰ انداز کا نمائندہ ہو جاتا ہے۔ اس فن میں قوت حافظہ کی شعوری کیفیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یعنی خود نوشت سوانح عمری کا مکمل انحصار یاد رکھنے کی قوت پر ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ فن بسا اوقات مہذ لے اختلافات سے مربوط ہو جاتا ہے۔ عام طور پر خود نوشت سوانح عمری میں بچپن کا بیان سرسری اور غیر مستند ہی ثابت ہو گا کیونکہ چند ضمنی یا دیں جو چھ سات برس میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ ان کی تشریح حافظہ کی بنیاد پر مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ خود نوشت سوانح لکھنے والا کتنا ہی پر خلوص کیوں نہ ہو بچپن کے بیان میں مبالغہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ عام طور پر جنگ اور انقلابی جدوجہد کے دوران بسر ہونے والا بچپن بہ نسبت ایک خاموش اور خوش حال بچپن کے زیادہ یاد رہتا ہے۔ اسی لیے بچپن کے بیان کو مکمل طور پر غیر مستند نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بعض اوقات بچپن کے حالات کے بارے میں انسانی حافظہ ایک درجہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ جس کی تکمیل کے لیے اس دور کے بزرگوں کے بیانات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خود نوشت سوانح عمری کسی حد تک واقعات کے بیان میں یادداشت کے سہارے بھی فن کی نشوونما کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ خود نوشت سوانح کے فن میں یادداشت کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود خود نوشت سوانح مکمل طور پر یادداشت پر بھروسہ نہیں کرتی بلکہ بہت سے خود نوشت سوانح نگار اچھے حافظہ کے علاوہ تحریری وسائل پر بھی تکیہ کرتے ہیں جس کے ذریعہ پورے سلسلہ کو یاد کرنا ممکن اور آسان ہو جاتا ہے۔

خود نوشت سوانح نگاری کے درمیان حافظہ اور یادداشت کی اہمیت

کو ثابت کرتے ہوئے پلوٹینس *Plutanius* لکھتا ہے کہ "حافظ، تاثرات کا دھند نہیں ہے بلکہ یہ روح کی خود کو متحرک کرنے کی قوت ہے جس سے اُسے وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے جو اس کے پاس نہیں تھی۔ حافظہ تخلیق بھی کرتا ہے اور امتداد زیادہ کے ساتھ ساتھ ترمیم و اضافہ بھی کرتا جاتا ہے"۔ لے

خود نوشت سوانح میں یادداشت اور حافظہ کی قوت کی وجہ سے تخلیقی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض خود نوشت سوانح عمریاں، تخلیقی ادب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ قوتِ حافظہ کی اس ضرورت کے انکشاف سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خود نوشت سوانح نگاری کے فن کو ارتقاء کے مراحل میں پہنچانے میں قوتِ حافظہ بہت بڑی مددگار ہے۔ جس کی وجہ سے خود نوشت سوانح نگار اپنی زندگی کے حالات اور جزئیات کو اعتماد کے ساتھ تحریری شکل دیتا ہے۔ اس فن میں مکمل طور پر پوری شخصیت کے اظہار کے امکان کی توقع پر تو یہ دی جاتی ہے۔ جس کے لیے قوتِ حافظہ اور یادداشت بہترین سہارے کا کام انجام دیتے ہیں۔

شرقِ نمود و نمائش اور میالغہ آمیزی بھی خود نوشت سوانح عمریوں میں کسی حد تک اپنا اثر دکھاتے ہیں۔

"عام طور پر خود نوشت سوانح نگار یہ حیثیت ایک آرٹسٹ کے فراریت پسند اور ایک بہتر حیات کا مستحق ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بہترین خود نوشت سوانح نگار میں ایک خدا داد تجزیاتی قابلیت، انتہائی بصیرت دارانہ انسانی بھائی کے احساس اور سب سے زیادہ ایک غیر جانب دار اور ناقص پسندانہ طرزِ عمل کی ضرورت ہے تاکہ بے تعلقی سے تبصرہ کیا جاسکے"۔ لے

سوانح نگاری کی فرض شناسی اور خودنوشت سوانح کے اصول کی غمازی کرتے ہوئے یہاں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ خودنوشت سوانح نگاری کا فن صرف شخصیت کا بیان ہی نہیں بلکہ ایک فنی کاوانا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خودنوشت سوانح پوری شخصیت کے اظہار کے علاوہ مکمل حیات کی پیش کش کی نمائندہ ہے جس کے ذریعہ حافظہ کو متحرک کر کے تاثرات بیان کیے جاتے ہیں اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ شخصیت میں پیش آنے والے رد و بدل کو تحریری جامہ پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طرح خودنوشت سوانح عمری ایک ایسا فن قرار پاتی ہے جس کے ذریعہ زندگی کی جزئیات، شخصیت کی حقیقت، جذباتی لغزشوں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ انسان میں پیدا ہونے والے تغیر کے علاوہ حافظہ کی بنیاد پر حالات اور واقعات کے ایسی منظر میں ایک افسانہ لہنی زندگی کا آپ محاکمہ کرتے ہوئے صاف گوئی کے ساتھ اپنی داستانِ حیات قلمبند کرتا ہے جسے اپنی طور پر خودنوشت سوانح عمری یا آپ بیتی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت خودنوشت سوانح عمری پیدائش سے لے کر آخر کی حیات تک کے حالات پر مبنی ایک ایسی داستان ہے جسے قلم کار اپنے قلم سے آپ تحریر کرتا ہے۔

خودنوشت سوانح کے بارے میں عام طور پر یہ پایا جاتا ہے کہ یہ بالواسطہ یا بلاواسطہ تین چار ہیجانوں سے منسوب کی جاسکتی ہے اور ہر ایک زمانہ نمایاں عبوری دور سے منسلک ہوتا ہے جس میں فرسودہ عادات اور جذبات ختم ہوتے اور نئی عادات وجود میں آجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ خودنوشت سوانح عمری میں مختلف ہیجانوں کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ یعنی خودنوشت سوانح نگاری انسانی زندگی کے یکساں اصولی پیش نہیں کرتی بلکہ سوانح نگاری کی زندگی کے وہ تمام رد و پیش کو قلم کار کے مطابق وہ مختلف سیاسی، معاشرتی، تمدنی اور

غیر قدرتی مسائل سے دوچار رہتا ہے۔ اس اعتبار سے خود نوشت سوانح، زمانہ کے تغیر و تبدل کے پس منظر میں اپنی شخصیت کا آپ جائزہ لینے کا نام ہے جس کے ذریعہ بنی اور بیگناتی سیرت کی تائید کی جاتی ہے۔ خود نوشت سوانح میں مصنف کی شخصیت اور اس کے اثر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا گیا ہے:

”ہر آپ بیتی اپنی نوعیت کے لحاظ سے مصنف کی شخصیت کی تابع ہوتی ہے اور وہ ایسی ہی نئی، غیر متوقع اور مختلف ہوتی ہے جیسی کہ ایک اجنبی شخصیت اس کا اسلوب بیان بھی اس شخصیت کا ایک جزو ہوتا ہے۔ لیکن شجرہ نسب سے ابتداء، بے جا طوالت، تصنیف کے لیے معذرت وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو عموماً مشترک نظر آتی ہیں۔ درنہ کہنا شاید ہی بے جا ہو گا کہ ہر ایک خود نوشت سوانح نگار آپ اپنا آئینہ ہے۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر ایک خود نوشت سوانح عمری نتیجہ ہے ایک فرد کے دماغی، جسمانی یا مادی بحران اور اس کے باعث رونما ہونے والے محرکات کا۔ جو اس میں یک گونہ تنہائی اور اپنی ذات سے متعلق ہمدردی، صفائی، دادخواہی یا ابلاغ کی ضرورت کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان کے ایسے علاحدہ علاحدہ خانے نہیں بنائے جاسکتے کہ ایک دوسرے میں گزرتے ہوئے۔“

خود نوشت سوانح نگاری میں سوانح نگار کی ضرورت اور اس کی اہمیت و افادیت کا اظہار کرتے ہوئے اس بیان میں ثابت کیا گیا ہے کہ خود نوشت سوانح نگار اپنے فن میں اظہار کے طریقے کے ذریعہ ذات خود اصول مدلل کرتا ہے۔ جس سے نہ صرف

فرد کی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے بلکہ شخص کی سماجی زندگی اور اس کے طرز عمل سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ اس عمل میں خود نوشت سوانح نگار امتیازی خصوصیت اور انوکھے انداز سے لوگوں کی تصویر اپنی جانب منعطف کرانا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ خود نوشت سوانح نگاری میں فن کار خود کی دریافت پر خصوصی توجہ دیتا ہے جس سے ابلاغ کو نئی راہیں ملتی ہیں اور اس کے انداز سے نئے اسلوب کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو میں سرسید اور غالب کی تحریروں میں یہ عکس ملتا ہے کہ انھوں نے اپنے قلم کے ذریعہ نہ صرف سوانحی مواد کی ترسیل کی بلکہ اپنے انوکھے انداز کے ذریعہ منفرد اسلوب کو بھی رواج دیا۔ سرسید کی اصلاحی کوشش اور تہذیب الاخلاق کے مضامین۔ غالب کے خطوط میں کلکتہ کا معرکہ اور قید فرنگ یہ ایسے ابواب ہیں جن میں سرسید اور غالب نے خود نوشت سوانح کے لیے مواد پیش کیا ہے۔ جس سے خود نوشت سوانح، فنی دریافت، داد و دہش اور مسرت کا جذبہ پیدا کرنے والی ایک ایسی طرز تحریر ثابت ہوتی ہے جس کے ذریعہ سوانح نگار خود کے حالات کو تحریری شکل دے کر اچھوتے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

خود نوشت سوانح، انسانی زندگی کی ایک دستاویز ہے جس میں انسانی زندگی کا تعلق انقلاب، سیاست، فنون لطیفہ، ادب، فلسفہ، مذہب اور دیگر رموز سے بتایا جاتا ہے۔ جس کے ذریعہ انسان اپنی شخصی دلچسپی کے سامان کو سوانحی روپ دے کر ادب میں شامل کرتا ہے۔ غرض خود نوشت سوانح، انسانی زندگی کی ایسی یادگار روداد ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی حیات کو اپنے قلم سے اظہار کا ذریعہ بنا کر اس میں ادبی چاشنی سمونے کی کوشش کرتا ہے خود نوشت سوانح کے فن کے بارے میں تحقیقی مواد پیش کرتے ہوئے انسائیکلو پیڈیا میں لکھا گیا ہے۔

“Autobiography is literally a man's

recording of his own life, Autobiography documents can be found in all cultures and all ages, but Autobiography as deliberate literary product is brought to existence only under certain conditions.

As a literary form autobiography is to be distinguished from then types of self-revelation most closely related to it, the diary, the Journals and the , the diary is a record of daily experience, the presentation of the day by day process of ones own life, without regards to petterend development, narration contininty, or diomatic movement towards a climex "۱

یادداشت اور روزنامہ کی اہم مصروفیات کی شمولیت سوانح عمری کی فنی ضرورت ہے یعنی خودنوشت سوانح عمری کے فن میں اگر ایک انسان اپنے

گذرے ہوئے واقعات کی اپنی مصروفیات اور اپنے عہد کے اہم واقعات شامل نہ کرے تو اس کی تحریر کردہ تصنیف خود نوشت سوانح کی حلف میں شامل نہیں ہوگی خود نوشت سوانح کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے حالات، خیالات کے علاوہ واقعات کو بقلم خود پیش کرے جس کے ساتھ ہی ادب، مذہب یا سیاست کے علاوہ زمانے کے انقلابات کے تاریخی جز کو بھی تحریر کا لازمہ بنائے۔ ان خصوصیات کی متخل تصنیف خود نوشت سوانح عمری کہلائے گی۔ خود نوشت سوانح نہ صرف ادب کا ایک خاص اظہار ہے بلکہ فنی اعتبار سے بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔ تذکرہ نگاری کی ترقی یافتہ شکل سوانح نگاری کے روپ میں ظاہر ہوئی اور سوانح نگاری نے اپنے اسلوب کو کئی اچھوتے انداز سے آشنا کیا جن میں خود نوشت یا دداشت، روزنامہ اور سفرنامہ اہمیت کے حامل ہیں۔ خود نوشت سوانح ایک مکمل صنف نہ ہونے کے باوجود بھی اپنے اندر کئی انداز تحریر کی خصوصیات رکھتی ہے۔ تذکرہ اور سوانح کے ذکر کا اختتام صرف خود نوشت سوانح پر نہیں ہوتا بلکہ خود نوشت سوانح خود متعدد قسموں میں تبدیل ہو جاتی ہے جن میں یادداشت، روزنامہ، سفرنامہ، ملفوظات اور سرگذشت کو خاص دخل ہے۔ جن کے بیان میں علیحدہ عنوانات کے تحت بحث کی گئی ہے۔ اُردو میں خود نوشت سوانح فنی اور تاریخی اعتبار سے ۱۸۵۷ء میں مولانا محمد جعفر تھانیسری کی کتاب "کالا پانی" سے عالم وجود میں آئی جو اُردو ادب کی پہلی خود نوشت سوانح ہونے کا درجہ رکھتی ہے۔ اُردو میں خود نوشت سوانح کے آغاز کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے علیم الدین سہلک تحریر کرتے ہیں۔

"ہمارے یہاں آپ بیتیوں کا رواج ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد شروع ہوا۔ جس قدر ملک ترقی کرتا گیا اسی قدر زیادہ آپ بیتیاں لکھی جاتی رہیں۔ چنانچہ سب سے پہلی آپ بیتی جو اُردو زبان میں لکھی گئی وہ مولانا محمد جعفر کی "کالا پانی" ہے۔ اس میں مولانا محمد جعفر تھانیسری نے اپنی زندگی

کے اس درد کا پورا پورا نقشہ کھینچا ہے جو انہیں جلا وطنی میں بسر کرنا پڑا^۱

خودنوشت سوانح ایک ایسی تحریری شکل ہے جس میں انسان کی زندگی سے لے کر دمِ تحریر تک کے حالات درج ہوتے ہیں اور اگر نندگی کے کسی اہم واقعہ کی تفصیل کسی فن میں درج ہو تو وہ آپ بیتی کہلاتے گی۔ اس طرح خودنوشت سوانح کا فن کئی طرزِ تحریروں کا مجموعہ ہو جاتا ہے۔ فنی اعتبار سے خودنوشت سوانح، زندگی سے لے کر دمِ تحریر تک کے حالات کی ایک عظیم سرگزشت ہے جو مصنف کے قلم سے عالمِ وجود میں آتی ہے اور اپنے فن کے ذریعہ زندگی کے مختلف رُخوں کی نمائندگی کرتی ہے۔

سوانح نگاری اور خودنوشت سوانح عمری میں صرف یہی فرق پایا جاتا ہے کہ سوانح عمری کسی انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات کو قلمبند کرتی ہے۔ جبکہ خودنوشت سوانح، انسانی عمر اور اس کی حیات تک کی کہانی ہے۔ یعنی خودنوشت سوانح، انسانی ذہن کی ایک ایسی کوشش ہے جس کے ذریعہ مصنف اپنی زندگی کے حالات اپنی حیات تک تحریری شکل میں قلمبند کر کے اپنی فنی خوبیوں سے آراستہ کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سوانح عمری زندگی کے تمام ادوار کی نمائندہ ہے اور پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات کسی دوسرے فرد کے ذریعہ تحریر کی جانے والی صنف ہے جب کہ خودنوشت سوانح محررانہ خصوصیات کی حامل ہے اور مصنف کے قلم سے اپنی زندگی کے حالات آپ تحریر کرنے کی ایک ایسی کوشش ہے کہ جس میں فنکار اپنی زندگی کے حالات آپ قلمبند کرتا ہے۔ یعنی کوئی بھی خودنوشت سوانح فن کار کی موت کے حالات قلمبند نہیں کر سکتی کیونکہ خودنوشت سوانح نگار اپنی موت کے حالات قبل از موت تحریر کرنے سے قاصر ہے لہذا اور اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں بھی

پیش قیاسی نہیں کر سکتا۔ اس طرح خود نوشت سوانح، انسانی زندگی کی ایک ایسی حد ہے جہاں فن کار کا قلم رکے گا وہیں خود نوشت سوانح اختتام کو پہنچے گی۔ جبکہ سوانح عمری، شخصیت اور اس کے کارنامے انسان کی موت کے بعد بھی بیان کرنے کے لیے پوری طرح پابند ہے۔ سوانح اور خود نوشت سوانح کے اس بنیادی فرق کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ تذکرے کے دامن میں پلٹنے والی سوانح نگاری کی صنف اپنے دامن میں خود نوشت سوانح کو جگہ دیتی ہے جس کے جلو میں آپ بیتی، سفر نامے، ملفوظات، روزنامہ اور سرگذر جیسی جدید تحریریں اپنا تاثر دکھاتی ہیں۔ خود نوشت سوانح ایک فعال تحریر ہے جو اپنے اندر دیرینہ خصوصیات کو چھپائے ہوئے فلک ادب پر رونما ہو رہی ہے۔

سوانحی ادب کے آغاز میں جن تحریکات کا شمار کیا جاتا ہے۔

یادداشت

ان میں یادداشت نگاری بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے اس کی حیثیت ایک طرز اسلوب جیسی ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی گم گشتہ یادوں کو اکٹھا کر کے تحریری ادب میں محفوظ کرتا ہے۔ "یادداشت" کو صنف نثر کی حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ یہ ایک مشترکہ طرز تحریر ہے جس کے ذریعہ سوانحی واقعات کو محفوظ حالت میں تحریری شکل دے دی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ طرز اسلوب، تاریخ، سوانح اور واقعات اور حالات سے متعلقہ ہوتا ہے لیکن اس کا شمار تاریخ میں نہیں کیا جاسکتا بلکہ اسے ادبی شکل دیدی جاتی ہے۔ ادب کی ایک تشکیلی صنف ہونے کی وجہ سے "یادداشت نگاری" فنی اور علمی طور پر سوانحی حیثیات کی حامل اور اردو کی قدیم صنف "تذکرہ نگاری" سے قریب ہے۔

یادداشت کا لفظ فارسی زبان سے اردو میں مروج ہوا۔ جس کے معنی یاد رکھنے کی نشانی کے ہوتے ہیں یعنی یادداشت سے مراد ایسی تحریری نشانی قلمرو دی جائے گی جو یاد رکھنے کے قابل ہو اور جسے بھلایا جانا ممکن نہ ہو۔ فارسی زبان میں

لفظ "یاد" کا استعمال خاص اہمیت کا حامل ہے جس کے معنی حفظ یا محفوظ رکھنے کے ہوتے ہیں۔ اسی لفظ "یاد" سے نئی ترکیب "یادداشت" وضع کی گئی اور اس لفظ کے ذریعہ حافظہ پر زور دیکر کسی نشانی کو یاد رکھنے کے مفہوم کی ادائیگی ہونے لگی۔ معنوی اعتبار سے "یادداشت" ایک ایسے مختلف معنی رکھتے والے لفظ کی نشاندہی کرتا ہے جس کے ذریعہ یادوں کو نشانی کے طور پر محفوظ کرنے کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یادداشت اس کیفیت کی نمائندگی بھی کرتی ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے حافظہ پر زور دیکر گزرے ہوئے واقعات کو یاد کرتا ہے اور اس کے بل بوتے پر اپنی زندگی کی کہانی ترتیب دیتا ہے۔ اس اعتبار سے یادداشت ایسی معنوی حیثیت کی حامل ہے جس کے ذریعہ گزرے ہوئے واقعات کو ذہن کی محفوظ حالت سے نکال کر تازگی کے طور پر دنیا کے سامنے لایا جاتا ہے۔

فارسی زبان میں یادداشت کا لفظ بھولی یا بھولنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر کوئی انسان اپنے کارناموں میں کسی اہم جز کو بھول جائے تو اس کے دوبارہ یاد دلانے کے لیے انسان کے ذہن پر جو بوجھ پڑتا ہے وہ یادداشت کہلائے گا۔ اس کے علاوہ یادداشت کا استعمال گم گشتہ یادوں کو تازگی بخشنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔ یعنی بھولی بسری خصوصیات اور واقعات کو ذہن میں دوبارہ جبکہ دینے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جائے گا وہی یادداشت کا درجہ رکھتا ہے۔

لفظ یادداشت نے فارسی طرز و اصل سے اردو میں رواج پایا جو درحقیقت یاد سے مرکب ہے۔ یادداشت مکمل ایک لفظ ہے یہ یاد اور کسی دوسرے لفظ کے ملائے سے نہیں بنا اور نہ اس کی حیثیت مرکب لفظ کی ہے بلکہ یہ مجرد لفظ کا حامل ہے۔ اس کی ترکیب کے بارے میں اتنا کہا جاسکتا ہے کہ یہ لفظ "یاد" سے مشتق ہے لیکن یہ دو حیثیتوں کا حامل نہیں بلکہ اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ لفظ "یادداشت" فنی طور پر استعمال ہونے سے پہلے

خاص مواقع پر پیش کرنے کے لیے مستعمل رہا۔ اس کے علاوہ آج بھی اس لفظ کا استعمال اعلیٰ افسران اور ذی حیثیت عہدہ دار کی خدمت میں سماجی مسائل کے معاملات کو پیش کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یادداشت ایک ایسی افادی دستاویز ہے جس کے ذریعہ توجہ دہانی اور معاملات کے حل پر نگاہ کو مرکوز کر دیا جاتا ہے۔ یعنی یادداشت کے ذریعہ اہم مسئلہ پر یادداشت شخصیت کی توجہ مبذول کر دینے اور اس کی شخصیت سے توقعات وابستہ رکھنے کا عمل تکمیل پاتا ہے۔

یادداشت لفظ کے لیے انگریزی میں REMINISCENCE مروج ہے جو لاطینی زبان سے انگریزی میں منتقل ہوا۔ یادداشت کا فن انگریزی ادب میں اردو زبان کی طرح مبسوط نہیں۔ اس کے علاوہ اردو ادب میں بھی اسی انداز کی بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ فنی طور پر ^{فہم} توجہ ڈال کر گزری ہوئی یادوں کو ضبط تحریر میں لانا "یادداشت نگاری" کہلاتا ہے۔ اردو ادب میں رشید احمد صدیقی کی کتاب "آشفستہ بیانی میری" کامیاب یادداشت نگاری کی نمائندہ ہے۔ جس میں رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ طالب علمی کے زمانے کی یادوں کو جمع کر دیا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب اردو نثر میں بہترین یادداشت قرار دی جاسکتی ہے جس کے توسط سے رشید احمد صدیقی نے اردو نثر کو یادداشت نگاری کا اچھوتا اسلوب دیا۔ انگریزی زبان میں مروجہ لفظ REMINISCENCE کا استعمال یادوں کو اکٹھا کرنے کے لیے عام طور پر ادب میں شامل ہے۔ انگریزی ادیبوں اور شاعروں نے اس فن پر توجہ دیتے ہوئے اپنے گزشتہ تجربات کو حافظہ کے بل بوتے پر تحریر کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ جس طرح اردو زبان میں "یادداشت نگاری" کا اسلوب کامیاب ہے اسی طرح انگریزی ادب میں بھی اس کی مثالیں گاہے مابے ملتی ہیں چونکہ خود نوشت سوانح، سفرنامہ، اور یادداشت میں ہلکا سا فرق ہے اس لیے اس اسلوب کو دوسرے فنون سے مختلف کرنا ایک دشوار امر ہے۔ یادداشت نگاری میں تذکرہ کی صفت

مہر گزشت کا انداز، سفر نامہ کا لہجہ، خود نوشت کے اصول، حالات کا ذکر اور سوانحی خصوصیات کا عکس پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت گزشتے ہوئے لمحات کا ایک روزنامہ ہے جس کے ذریعہ تخلیق کار اپنے قلم کو فنی طور پر ماضی کے واقعات اور حالات کو مستقبل میں نمایاں کرتا ہے یعنی یادداشت نگاری میں فن کار مستقبل کے قلم سے ماضی کا تذکرہ کرتا اور گزشتے ہوئے لمحات کو مستقبل کی درختانی بخشا ہے۔ اس اعتبار سے یادداشت نگاری ایک ایسا اسلوب ہے جس کے ذریعہ ماضی کے جھروکوں کو مستقبل کے زنداں میں قید کیا جاتا ہے۔

اردو نثر میں یادداشت نگاری کی طرز اور اس کا اظہار گستاخی سے وابستہ رہا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سفر نامہ اور خود نوشت سوانح کی ابتداء ہوئی اور محمد جعفر تھانی نے کالابانی لکھ کر خود نوشت سوانح کو فروغ دیا۔ اس طرح ۱۸۴۷ء میں یوسف خاں کمیل پوش نے ”عجائبات فرنگ“ لکھ کر سفر نامہ کا آغاز کیا۔ لیکن طویل عرصہ تک یادداشت نگاری پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ رشید احمد صدیقی نے سب سے پہلے علی گڑھ کی طالب علم زندگی کو ضبط تحریر میں لا کر ”یادداشت“ نگاری کے اسلوب کا آغاز کیا اس طرح اردو نثر میں اس فن کی ابتداء ہوئی۔

سوانح نگاری اور تذکرہ کی ایک بدلی ہوئی طرز تحریر یادداشت کے بارے میں اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یادداشت نگاری، خود نوشت سوانح کی ایک قریبی شکل ہے۔ لیکن اس فن میں کوئی تفریق پائی جاتی ہے۔ یادداشت کا تعلق سوانح نگاری سے مکمل طور پر نہیں جس طرح تذکرہ نگاری اور خود نوشت سوانح کے ذریعہ صاحب شخصیت کے کارناموں کو ابھارا جاتا ہے۔ اسی طرح یادداشت کے ذریعہ بھی انسانی شخصیت اور سیرت کا عکس پیش کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اکثر کیا جاتا ہے۔

”یادداشت، خود نوشت سیرت کے بہت قریب پہنچ جاتی ہے، بلکہ خود نوشت اور یادداشت کے نام اکثر اس طرح استعمال کیے جاتے ہیں گویا ان کا آپس میں رد و بدل ہو سکتا ہے۔ لیکن ان میں سیرت و کردار اور بیرونی واقعات کو اضافی اہمیت کی نسبت بجا طور پر امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ یادداشتوں میں بعض شخصیتوں اور افعال کو جو مصنف سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔ بعض میں تاریخی واقعات کے بیانات کے علاوہ جو براہ راست لکھنے والے کے مشاہدے میں آتے ہیں شاذ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔“

یادداشت کو خود نوشت یا سوانح نگاری سے مربوط نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سفرنامے اور روزنامہ کی طرح ایک علمدہ تحریری شکل ہے جس کا تعلق سوانح نگار کے فن سے قریب کا ہے۔ اس فن میں انسانی سیرت، کردار اور عمل کی یادگار خصوصیت کو یادوں کے سہارے اکٹھا کیا جا کر انہیں تحریری شکل میں واضح کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یادداشت ایسی تحریر قرار پاتی ہے جس میں مصنف اپنے مشاہدات اور واقعات کی تحریر کے لیے منفرد اسلوب اختیار کرتا اور اپنے گزرے ہوئے چند قیمتی لمحات کو ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ اپنی زندگی کے واقعات تحریر کرنا خود نوشت سوانح نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے ذریعہ انسانی زندگی کا وہ تسلسل جو پیدائش سے لے کر حالات تصنیف تک برقرار رہتا ہے، یادداشت میں پیش نہیں ہوتا یعنی یادداشت نگار اپنے گزرے ہوئے لمحات میں سے چید چیدہ واقعات کو ضبط تحریر

میں لانا ہے جیسے نہ صرف سوانح سے قربت حاصل ہے بلکہ خود نوشت سوانح بھی اس تحریر میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ کوئی فرد عالم پیری میں اپنی جوانی اور جوانی سے منسلک واقعات کو یاد کر کے کچھ اہم واقعات تحریر میں لائے اور اس کا تسلسل بچپن سے نہ ہو اس کے علاوہ اس کا تعلق بڑھاپے سے بھی قائم نہ کیا جائے تو ایسی تحریر یادداشت نگاری کے صیغہ میں شمار کی جائے گی۔

اگرچہ یادداشت میں خود نوشت سوانح کا عنصر پایا جاتا ہے ممکن ہے فنی طور پر مختصر سے اختلاف کی بنا پر یادداشت کو خود نوشت سوانح سے علاحدہ طرز تحریر قرار دیا جائے، لیکن اسے ایک مکمل صنف ادب کی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ یادداشت نگاری کا طریقہ قدیم دور سے ہی مروج رہا۔ اس سلسلہ میں لکھا گیا ہے :

"لیڈی فین شاہ کی لکھی ہوئی یادداشت جو ۱۶۷۲ء کی تصنیف ہے۔

ذاتی تجربے کی بہترین نمونہ ہے۔ اس میں لیڈی فین شاہ نے ہیرہ وینے کی کوشش نہیں کی ہے۔" ۱۷

یادداشت کے فن کی وضاحت اس حوالہ میں پوری طرح ہو جاتی ہے۔

عام طور پر خود نوشت سوانح اور سوانح حیات میں شخصیت اور اس کے کردار کو اس قدر واضح کر دیا جاتا ہے کہ اس کے مطالعہ سے صرف شخصیت نگاری کا اظہار ہو سکتا ہے لیکن یادداشت نگاری صرف شخصیت نگاری پر توجہ نہیں دیتی بلکہ شخصیت کے ان حالات کو پیش کرتی ہے جو زندگی کے کئی حصوں میں انجام پاتے ہوں اور جن کا بیان زبان اور ادب کے لیے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے یادداشت نگاری ایک موزوں اور محنت دل طرز تحریر قرار دی جاسکتی ہے۔ جس کے ذریعہ انسان اپنی بکھری

ہوئی ناقابل فراموش یا نگاروں کو مجتمع کر کے انہیں سوانحی شکل دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یادداشت نگاری عام مقبولیت حاصل نہ کر سکی کیونکہ اس فن کی تحریر کے لیے اپنی زندگی کے اہم اور ناقابل فراموش واقعات کا محاکمہ کرنا کافی دشوار ہے۔ ہر انسان اپنی زندگی کے بیشتر واقعات کو اہم سمجھتا ہے۔ اس لیے زندگی سے مربوط لاتعداد واقعات سے ناقابل فراموش واقعہ کو منتخب کرنا اور اس سے متعلق جزوی واقعات کو حافظہ پر زور دیتے ہوئے تحریری شکل میں پیش کرنا ایک مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبیات میں سوانح اور خودنوشت سوانح نگار بکثرت دکھائی دیتے ہیں لیکن یادداشت نگاروں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اپنی زندگی کے اہم واقعات میں سے دلچسپ اور پراثر نصیحت کارنامے کو تلاش کرنے کی دشواری ہے۔

یادداشت نگاری درحقیقت خودنوشت سوانح کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے جس میں سوانح کا عکس ملتا ہے لیکن اسے خودنوشت سوانح سے اس لیے مختلف تصور کیا جاتا ہے کہ خودنوشت سوانح میں زندگی کے تمام واقعات درج ہوتے ہیں جبکہ یادداشت میں زندگی کے چند اہم واقعات کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ یادداشت اور آپ بیتی کو یکجا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ آپ بیتی انسان پر گزرنے والے صدمات اور واقعات کا اظہار ہے اور اس کے ذریعہ زندگی کے کسی ایک پہلو جیسے قید خانہ کی زندگی یا پھر مفلسی و بد حالی میں گزرنے والے لمحات کا ذکر ہوتا ہے۔ یعنی آپ بیتی زندگی کے کسی ایک اہم واقعہ کی خودنوشت سوانح ہے جبکہ یادداشت انسانی زندگی میں تغیر لانے والے چند واقعات کا مجموعہ اس اعتبار سے یادداشت اپنے مبدائے اصلی یعنی خودنوشت سوانح اور آپ بیتی سے مختلف ہونے کا مزاج رکھتی ہے۔

سرگزشت اور یادداشت میں بھی مختصر اختلاف پایا جاتا ہے۔ عام طور پر سرگزشت میں انسان اپنی زندگی کے کمپرسی اور بد حالی کے واقعات قدیم و اخیر

کے ساتھ تحریر میں لانا ہے۔ جس میں دلچسپی اور قلم کی روانی پر زور دیا جاتا ہے۔ اس طرح سرگزشت نگار کا مقصد اپنی داستانِ حیات بیان کرنے سے زیادہ قارئین کی دلی چسپی برقرار رکھنا ہوتا ہے جبکہ یادداشت نگاری صرف نصیحت و عبرت کے حصول کے لیے زندگی کی کسی ایک ڈگر کی نمائندگی کرنے والے واقعات کو اکٹھا کرنے کا نام ہے اس طرح یادداشت نگاری اپنے اصولوں کے اعتبار سے سرگزشت سے بھی مختلف ہے۔ یادداشت نگاری کا رشتہ روزنامچہ اور سفرنامہ سے بھی نہیں جوڑا جاسکتا۔ اس لحاظ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یادداشت نگاری، سوانحی مزاح رکھتے ہوئے بھی سوانح کے دیگر انداز تحریر جیسے روزنامچہ، سفرنامہ، سرگزشت، آپ بیتی، خودنوشت سوانح اور ملفوظات سے علیحدہ ایک نثری طرز تحریر ہے جس میں سوانح کا عمل اور خودنوشت سوانح کی جھلکیاں موجود ہیں۔

اردو نثر کے منفرد اسلوب میں مختلف طرز نگارشات کو شامل

روزنامچہ

کیا جاتا ہے۔ "ان میں روزنامچہ" بھی اپنی اہمیت و افادیت رکھتا ہے خاص انداز منفرد دلچسپ اور بیان کے ساتھ یہ اسلوب عام انسان کی زندگی کے حالات اور معاملات کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ روزنامچہ اپنی خصوصیت کی بنا پر کوئی علیحدہ صنف میں شمار نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا مرتبہ ایک مرکب صنف کی حیثیت سے دھنچا ہوتا ہے۔ انسان کی روزمرہ مصروفیات اور مشاغل کا ذکر اس اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ درحقیقت یہ اسلوب سوانحی بنیاد کا علمبردار ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کے اہم واقعات اور روزانہ کے معمولات کو تاریخ میں مقید کرتے ہوئے اپنی حیات کی سوانح مرتب کرتا ہے۔ روزنامچہ ایک طرز اسلوب ہونے کے علاوہ سوانحی شکل و حیثیت بھی رکھتا ہے جس کی ابتدا اردو میں "تذکرہ نگاری" سے ہوتی ہے۔

اردو زبان میں لفظ روزنامچہ کا استعمال فارسی کے ذریعہ ہوا۔ فارسی

زبان میں روزنامہ یا روزنامچہ۔ اسی کتاب یا تحریر کے پیشے سے متعلق ہے جس میں روز کا حال بیان کیا جائے۔ روزنامچہ کی لغوی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ ایسی کتاب جس میں روزانہ واقعات حالات اور رد واد کا ذکر ہو اس کا شمار "روزنامچہ" میں کیا جائے گا۔ لغوی بنیادوں پر روزنامچہ، روز کا حال لکھنے کا نام ہے روز کے حال سے مراد ان تمام ضروریات کیفیات اور حالات کا ذکر روزنامچہ میں پیوست ہو جائے گا جو انسانی زندگی میں حرکت کے ضامن ہیں۔ انسان کی سیاسی دلچسپیاں، معاشی جدوجہد، علمی و ادبی مشاغل، سماجی و فلاحی مصروفیات، رکھ رکھاؤ، شاہانہ و فقیرانہ طرز و انداز اور مذہبی و روحانی تبلیغ کا ذکر بھی ہر روز کی تاریخ میں بیان کیا جائے تو وہ "روزنامچہ" کی لغوی معنی کی نمائندگی کرے گا۔

فارسی زبان میں "روزنامچہ" کا استعمال عام طور پر بادشاہوں کے محوالات اور ان کی روزانہ مصروفیتوں کو تحریری انداز میں رواج دینے کے لیے کیا جاتا ہے۔ یعنی اپنی دن بھر کی مصروفیات کو منصوبہ بند طور پر مرتب کرنے کے لیے بادشاہ یا امرا ایک مخصوص طریقہ اختیار کرتے تھے جس کی تفصیل وقت اور تاریخ کے لحاظ سے تحریری طور پر محفوظ کر دی جاتی تھی اور یہی عمل ہر روز کی مصروفیات کا نمائندہ ہوتا ہے چونکہ ایسی تحریروں میں روزانہ کی مصروفیات کا ذکر ہوتا۔ اس لیے انھیں "روزنامچہ" کا عنوان دے دیا گیا۔ ایرانی اور ہندوستانی بادشاہوں کے درباروں میں روزنامچہ نگار موجود ہوتے جو بادشاہ کی مصروفیات کی تفصیل ہر روز کے بیان میں قلمبند کرتے تھے۔ یہی طریقہ آج کے ادیب اپناتے ہیں اور انہیں ادبیات میں "روزنامچہ نگاری" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

لفظ "روزنامچہ" فارسی ترکیب سے اردو میں مروج ہوا۔ فارسی زبان میں "روزنامہ" لفظ اس کی ابتدائی پنج "روز" سے اختیار کیا گیا ہے۔ فارسی میں "روز" کا لفظ "دن" کے لیے مستعمل ہے اور اسی روز سے ایک نئی ترکیب "روزنامچہ" اختیار

کی گئی۔ "روزنامہ" کا لفظ دو الفاظ سے مرکب ہے جس کے مطابق روز بمعنی دن نامہ بمعنی "لکھا ہوا" کے لیے گئے ہیں۔ اس طرح "روزنامہ" سے مراد ایسی تحریر ہوگی جو دن بھر کی مصروفیات کو ایک ہی دن میں تحریری طور پر پیش کیا کرے یعنی آج کی مصروفیات کو آج کی تاریخ میں ہی لکھنا "روزنامہ" کہلائے گا۔ یہ ممکن ہے کہ طوالت یا مصروفیات کی بنا پر آج کے مشاغل دوسرے دن تحریر کیے جائیں لیکن روزنامہ کے ذریعہ صرف ایسی تحریریں ادبی اسلوب میں شمار کی جائیں گی جو روز کی کیفیات کی نشاندہی کرتی ہوں۔ فارسی زبان کے دو الفاظ کے اشتراک سے بننے والا لفظ "روزنامہ" فنی طور پر ایک منفرد اسلوبِ نثر کی حیثیت سے فارسی اور اردو زبان میں مروج ہوا۔

انگریزی زبان میں روزنامہ کے لیے DIARY کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ ڈائری اپنی بنیاد کے اعتبار سے لاطینی زبان کے DIARIUM سے استفادہ کرتا ہے۔ لاطینی زبان میں DIARIUM کے معنی DAY یا دن کے ہوتے ہیں۔ DIARIUM کا لفظ تصرف میں لایا جا کر DIES میں تبدیل ہوا اور پھر وہ اپنی ہیئت بدلتے ہوئے DAY کی حیثیت اختیار کر گیا۔ لفظ DAY سے انگریزی میں ڈائری DIARY کا رواج ہوا جو درحقیقت لاطینی لفظ DIARIUM کا مترادف ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی زبان میں DIARY کا لفظ روزنامہ کے لیے موزوں اور متبادل قرار دیا جاسکتا ہے۔ فنی طور پر ڈائری کے اسلوب اور اس کے انداز و تشکیل کی تعریف کرتے ہوئے انسائیکلو پیڈیا کے مرتبین نے روزنامہ کے بارے میں لکھا ہے۔

"A Daily record of events kept by a diarist It describes matters coming under the writer's observation, including those gleaned from

contemporary reports correspondence and conversation with his personal comments. Not all daily record kept by an individual are diaries in the generally accepted sense of terms connoting those which have biographical, historical or literary value. the word journal is often used synonymously. The Sir Walter Scotts Journals is diary. The ancient Greeks kept diaries (ephemerides)

”روزنامہ نویسی“ کی نئی تعریف کرتے ہوئے اس بیان میں انسائیکلو پیڈیا کے مرتبین نے بتایا ہے کہ روزنامہ سے مراد ایسے اندراجات ہیں جن میں روزانہ معاملات کا ذکر کیا جائے۔ اس کے علاوہ اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ روزنامہ نویس اپنی تحریر سے اندراجات کرتے ہوئے روزانہ تحریر کرنے کے فن کو ظاہر کرتا ہے یعنی روزنامہ نویسی تحریری خصوصیت قرار پائے گی جس میں بذات خود اپنے حالات اور تجربات ہر روز کی روشنی میں قلمبند کیے جائیں۔ درحقیقت روزنامہ نویسی ذاتی مشاہدات کی آئینہ دار ہے جس کے ذریعہ مصنف اپنے روزانہ کے حالات لکھتا اور بیانیہ انداز کے ذریعہ روز کے معاملات کی روشنی میں خود کی زندگی کا عکس پیش کرتا ہے۔

روزنامہ کی تشریح کرتے ہوئے اس بیان میں بتایا گیا ہے کہ یہ ایسا طرز اسلوب ہے جس کے ذریعہ دستاویزی خصوصیت تکمیل پاتی ہے۔ یعنی روزنامہ نویسی کی

تقریروں سے مخصوص دور کے حالات کے پس منظر میں زندگی رواں دواں دیکھی جاسکتی ہے۔
ڈائری درحقیقت چند اندراجات، خانگی معاملات، انفرادی خصوصیات اور باہمی گفتگو کے علاوہ خط و کتابت اور مراسلت سے مربوط ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا شمار شخصی حالات و معاملات کی عکاسی کی وجہ سے سوانح عمری میں کیا جاتا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ روزنامہ شخصی سوانح عمری کی حیثیت رکھتا ہے۔

روزنامہ کو اردو کی قدیم طرز تحریر ”تذکرہ“ سے اس لیے مربوط کیا جاتا ہے کہ اردو زبان میں جدید صنف سوانح نگاری کی تشکیل تذکرہ گوئی سے ہوئی۔ اس کے علاوہ روزنامہ ایک انسان کی شخصیت کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ جس میں خود نوشت سوانح کی خصوصیت اور فن سوانح نگاری کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روزنامہ نویسی اردو تذکرہ نگاری سے قریب، سوانح نگاری سے ازنی رشتہ اور خود نوشت سوانح سے پوری طرح استفادہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے روزنامہ، سوانح، تذکرہ اور خود نوشت سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔

روزنامہ نویسی کے دوران سیاسی، سماجی اور ادبی اقتدار کی پیشکش ممکن ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی اور معاشرتی معاملات کی جھلکیاں بھی مبسوط حیثیت میں روزنامہ کے ذریعہ اکٹھا کی جاتی ہیں۔ شخصی واردات اور منفرد ہنریت کی عکاسی بھی روزنامہ کے ذریعہ ممکن ہے۔ ایک اعتبار سے روزنامہ سوانحی، تاریخی اور ادبی اقتدار کا حامل ہوتا ہے جس میں شعوری طور پر ذاتی حالات قلمبند کرنے کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ اگرچہ روزنامہ نویسی ایک مکمل صنف کی حیثیت نہیں رکھتی لیکن اس طرز کے ذریعہ شخصی انفرادیت اور ذاتی صلاحیت کے علاوہ اہم خدمات اور خصوصیات کا ذکر روزنامہ کی تاریخ کے پس منظر میں کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں روزنامہ نویسی کو بنیاد بنا کر خود نوشت سوانح عمریاں لکھی جا رہی ہیں۔

روزنامہ نویسی کے ذریعہ شخصیت اور کارناموں کی تحقیق اور مواد کی فراہمی کا عمل تکمیل پا سکتا ہے۔ زندگی کے حقائق، اصلیت کے روپ میں نمایاں ہو سکتے ہیں یعنی اگر کوئی محقق کسی شخصیت کی سوانح اور خدمات کی پیش کش کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کے لیے موضوع اور مواد کی فراہمی میں روزنامہ نگار کا اسلوب اپنا حق ادا کر سکتا ہے۔ ان بنیادی خصوصیات کی وجہ سے روزنامہ نگار کو ایک اسلوب کے درجہ کے علاوہ شخصیت اور کارناموں کی تحقیقی تشکیل میں معاون بننے والا بہترین طرزِ اظہار کی حیثیت دی جاتی ہے۔ روزنامہ نگار، اردو نثر کی ایک قیمتی طرزِ تحریر ہے جس سے تشکیل انسانیت کے علاوہ خدمات اور عکس واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ روزنامہ نگار کے فن کے بارے میں یہ کہا گیا ہے۔

”ڈائری یا روزنامہ ادب کا ایک شعبہ ہے بعض روزنامے عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ اٹلی اور انگلستان میں بعض نامور ادیبوں نے اپنے روزنامے لکھے۔ ان روزناموں سے نہ صرف لکھنے والے کے سوانح معلوم ہوتے ہیں بلکہ اس کے دور پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم ایک پورے دور کو ایک شخصیت کے روزنامہ میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں خواجہ حسن نظامی کے روزنامے بڑے مقبول ہوئے۔ یہ روزنامے اولاً رسالہ ”درویش“ دہلی اور اس کے بعد رسالہ ”منادی“ دہلی میں شائع ہوتے رہے۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو روزنامے اشاعت کی غرض سے تحریر میں لائے جاتے ہیں ان میں ایک پہلو تلاش کا ہو سکتا ہے۔ اردو سہ ماہی حقیقت کا۔ یعنی لکھنے والا جس رنگ میں اپنے کو پیش کرنا چاہے۔ روزنامہ نگار کی بہترین صورت وہ ہے۔ جب لکھنے والا اپنی یا دداشت سے یا روزنامہ نگار کے ذریعہ اشاعت

کی غرض سے۔ خود نوشت سوانح نگاری میں روزنامچہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ روزنامچہ میں مصنف کے شب و روز کا ذکر خود اں کے قلم سے ہوتا ہے۔ روزنامچہ کی ایک خالص ادبی صورت بھی ہے۔ لہ

شخصیت اور شخصیت کا تعلق عہد سے اور پھر زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ روزنامچہ کے ذریعہ تکمیل پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزنامچہ جزئیات اور پرکاری میں بعض اوقات خود نوشت سوانح سے بھی بازی لے جاتا ہے۔ انسان کے روزانہ حرکات اور مشاہدات کا ذکر صرف روزنامچہ کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اور اسی فن کو بنیاد بنا کر سوانح ترتیب دی جاسکتی ہے۔ درحقیقت روزنامچہ ایک ایسی طرز تحریر ہے جس میں جذبات، تاثرات اور مشاہدات کے علاوہ عام حالات کے تغیر کا جائزہ بھی ممکن ہے۔ اس لیے روزنامچہ ذاتی تجربات، شخصی کارنامے اور سیاسی، معاشی، اقتصادی تبدیلیوں کا ایک ایسا اظہار ہے جس کے ذریعہ انسان کی شخصیت کے مختلف دنیاوی معاملہ سے دل چسپی کا پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر سید شاہ علی روزنامچہ کی خصوصیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”روزنامچہ نگاری میں بھی اسی قدر تنوع پایا جاتا ہے جس قدر کہ فطرت انسانی میں کسی نادر یا افسانے کے انجام کی طرح اس کی دل چسپی بھی سب سے زیادہ مستقبل سے نا اگہی میں مضمر ہوتی ہے جو مصنف کے ذہنی عمل اور رد عمل کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی لیے روزنامچہ نگاری کے لیے کسی نمونہ کی ضرورت بھی ہے نہ ادبیت کے اظہار کی لیکن ایک چیز جس پر زور دینا ضروری ہے وہ ایجاز و اختصار ہے۔ طوالت، لکھنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کے لیے

دردِ سر کا باعث بن جاتی ہے اور اظہارِ مطلب کے لیے بھی طوالت غیر ضروری
بلکہ مضرب ہے۔" لہ

روزنامچہ کی تحریر کے لیے اختصار کو ضرورت قرار دیتے ہوئے یہ ثابت
کیا گیا ہے کہ روزنامچہ نویسی ایک بہترین طرزِ تحریر ہے۔ لیکن اس فن کو طوالت کی
وجہ سے نقصان پہنچتا ہے۔ اگر روزنامچہ مختصر اور جامع ہو تو اس کی ادبی حیثیت دو بالا ہو
جائے گی۔ روزنامچہ نگار کو ناول اور افسانہ نگار کی طرح اپنی روزانہ مصروفیات کو
ادبی انداز کے علاوہ تجسّسِ امیز اسلوب سے نوازنا پڑتا ہے تاکہ پڑھنے والوں کی دل چسپی آغاز
سے اختتام تک برقرار رہے۔ ایک بہترین روزنامچہ کی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ
مختصر وقت میں پڑھا جاسکے اور ساتھ ہی ادبی طور پر اس میں محویت کو اس طرح مدغم کیا
جائے کہ جس کے بعد روزنامچہ، افسانوی خصوصیت اور ناولانہ صلاحیت کا علمبردار ہو جائے۔
روزنامچہ نگاری میں ذاتی تاثرات کو زبانِ دیوان کی چاشنی سے مربوط کیا جاتا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ روزنامچہ اسی وقت کامیابی کے زینے طے کر سکتا ہے جبکہ اس کے تحریر
کرنے کا انداز منفرد حیثیت کا حامل ہو اور اس کی تحریر میں لچک اور جاذبیت ہو۔
عام طور پر مبہم اسلوب اور غیر معیاری طرزِ دانِ انداز سے فن کو اجاگر کرنے والا مصنف، روزنامچہ
کے ذریعہ منظرِ عام پر نہیں آسکتا۔ کیونکہ اس کی تحریر جاذبِ نظر نہیں ہوتی۔ روزنامچہ کے لیے
تحریر کی دل کشی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی روزنامچہ کے ذریعہ نہ صرف ایک فرد اپنی
زندگی کے واقعات قلمبند کرتا ہے بلکہ اپنے معاصرین سے تعلقات کا بھی ذکر کرتا ہے۔
جس کی وجہ سے روزنامچہ نگاری میں ایک عہد کے واقعات و حالات کی تاریخ کو شخصیت
کے پس منظر میں یکجا کیا جاسکتا ہے اور اس خصوصیت کی بنا پر روزنامچہ ایک انفرادی
طرزِ تحریر کا آغاز ہو جاتا ہے۔

سفرنامہ

انسان کی زندگی کئی حالات اور واقعات سے مربوط

ہوتی ہے۔ زندگی کو گزارنے کے لیے وہ مختلف نشیب و فراز سے گزرتا اور خوش حالی و بد حالی کا سامنا کرتا ہوا اس دنیا میں اپنی بود و باش کو آگے بڑھاتا ہے۔ زندگی کا ایک عجیب و غریب لمحہ نقل مقام کرنے سے متعلق ہے یعنی ہر انسان کو زندگی کے کسی حصے میں بھی ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اسی دوران سفر کے حالات کو تحریری شکل دے کر نثر میں پیش کرنا "سفرنامہ" کہلاتا ہے۔ یعنی انسانی زندگی کے وہ حالات جو سفر میں بیت جائیں ان کا تذکرہ کرنا "سفرنامہ" کی تعریف میں شامل ہے۔ "سفرنامہ" کا ربط فنی طور پر تذکرہ سے قریب اور سوانح سے بالکلے منسلک ہے۔ اسی لیے سفرنامہ کو تذکرہ نگاری کی ایک شکل سمجھا جاتا ہے۔

اُردو کے نثری اسلوب میں "سفرنامہ" ایک خاص انداز اور طرز نگارش کا نمائندہ ہے۔ اس فن کے ذریعہ انسان اپنے حالات سفر بیان کرتا اور مشکلات و مصائب کا ذکر کرتے ہوئے اپنی زندگی کے حالات قلمبند کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سفرنامہ فنی طور پر خود نوشت سوانح سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ سفرنامہ کوئی علیحدہ صنف نثر نہیں بلکہ یہ مرکب طرز تحریر کا درجہ رکھتا ہے۔ جس کے ذریعہ انسان کے حالات سفر سے واقفیت ہوتی ہے۔ فنی طور پر سفرنامہ ایک طرز نگارش کے علاوہ کوئی ادراہی حیثیت نہیں رکھتا اگرچہ ادبی طور پر سفرنامہ تحریر کرنے کا رواج قدیم زمانے سے رہا لیکن اسے مکمل صنف ادب کی حیثیت نہیں دی گئی۔ کیونکہ یہ زندگی کے کسی ایک پہلو کی نمائندگی کرتا ہے۔

"سفرنامہ" کا لفظ عربی سے اُردو میں مروج ہوا جو دو الفاظ سے مرکب ہونے

کی دلیل پیش کرتا ہے۔ عربی زبان میں سفر کا لفظ مسافرت یا وطن سے باہر جانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا عربی لفظ نامہ کے معنی لکھا ہوا خط یا چٹھی کے ہوتے ہیں۔ اس ترکیب سے سفرنامہ کی حیثیت لکھی ہوئی مسافرت یا سفر کے دوران لکھا ہوا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ معنوی اعتبار سے سفرنامہ سے مراد ایسی طرز تحریر ملی جائے گی جس میں کوئی انسان وطن سے باہر سفر کر کے اس سفر کے حالات تحریری طور پر قلمبند کرے۔ اس اعتبار

سے سفرنامہ ایک ایسا طرز اسلوب قرار پاتا ہے جس کے ذریعہ حالات سفر کو طرز نگارش کی زینت دینے کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔ اس طرز تحریر کے ذریعہ سفر کے دوران پیش آنے والے حیرت انگیز اور عجیب و غریب حالات کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ طرز تقریر فی طور پر دلچسپ اور محویت کو برقرار رکھنے والی سمجھی جاتی ہے۔

اردو نثر میں سفرنامہ کا فن قدیم دور ہی سے رائج رہا۔ بسا اوقات سفرنامہ داستانی انداز پر بھی لکھے گئے۔ ان داستانی سفرناموں میں حیرت و استعجاب اور دلچسپی کے تمام سامان میسر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سفرنامے ہر ادب میں اپنی حیثیت اور مقبولیت رکھتے ہیں۔ اردو میں "سندھ یاد جہازی" کا سفرنامہ داستانی انداز پر لکھا گیا ہے۔ اس کا سبب بننا ہے۔ اسی لیے سفرنامہ ثقافتی تعلقات ہموار کرنے کا ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس سے نہ صرف تلاش و جستجو کا اظہار ہوتا ہے بلکہ نئی دنیا کی دریافت اور سفر کے دوران انسانی تجربات کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ دنیا کے ادبیات میں سفرنامے تجسس ذہنیت کے علمبردار ہیں۔ ایک انسان کا اپنے وطن سے نکل کر جنگلوں میں مارے مارے پھرتا دیا دیا اور سمندر و دریاؤں کے مقابلے کرنا، طرح طرح کے مصائب سے دوچار ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک انسان میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ سفر کرے اور نئی نئی جگہیں دریافت کرے۔ سفرناموں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا جاتا ہے:

”ہر زبان کے ادب میں سفرناموں کی بہتات ہے ان سفرناموں میں

بعض اوقات بے سرو پا باتیں بھی ہوتی ہیں۔ سفر کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ

جو کچھ ہم بیان کریں گے اس پر پڑھنے والے پر یقین کر لیں گے۔ چنانچہ وہ جھوٹ اور سچ کو غلط ملط کرتے آئے ہیں۔ بہر حال مبالغہ آرائی سے قطع نظر بھی سفر ناموں میں بہت ہوتا ہے۔ ان میں دوسروں کے حالات بھی ہوتے ہیں۔ اور اپنے تجربات بھی۔ ان میں مشہور مقامات اور مشہور شخصیات کی تصویر کشی بھی ہوتی ہے۔ اس طرح جنگ میچی کا سنگم اگر ملتا ہے تو سفر ناموں میں ان سفر ناموں کے پڑھنے سے ہماری فطرت کا ایک بنیادی تقاضہ تسکین پاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سفر نامے اس قدر مقبول ہیں۔ اردو زبان میں بھی سفر ناموں کی کوئی کمی نہیں۔ علامہ شبلی اور خواجہ حسن نظامی نے بلاد اسلامیہ میں اپنے سفر کا حال ایسے منفرد انداز میں لکھا ہے کہ ان کے سفر نامے ہمارے ادب کا جز بن کر رہ گئے ہیں۔

سفر نامے کے فن کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ درحقیقت سفر نامہ ایک ایسا طرز تحریر ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے مشہور مقامات اور مشہور شخصیتوں کے ذکر کے علاوہ سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات کو بھی اپنی طرز تحریر کا ذریعہ بناتا ہے۔ یعنی سفر نامہ سفر کے دوران پیش آنے والے حادثات کے علاوہ تاریخی مقامات اور دستاویزی حیثیت کی چیزوں کا تذکرہ ہے جس سے سفر نامہ لکھنے والا متاثر ہونے کے بعد انہیں تحریری شکل دیتا ہے۔ سفر نامے میں صرف سفر کا حال نہیں لکھا جاتا بلکہ مصیبتوں کے ناگہانی آجانے اور ان کی روک تھام کے لیے انسانی تدبیر کا ذکر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفر نامے میں ہیبت، سراسیمگی اور انوکھا پن محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ سفر نامے میں بعض اوقات ناممکنات کا اظہار بھی ہوتا ہے یعنی

سفر نامے اس قدر حیرت ناک ہوتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سفر نامہ امیڈن کے سہارے آگے بڑھ رہا ہے۔ سفر نامے کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ اسی کے ذریعہ انسان کی زندگی میں پیش آنے والے عجیب و غریب واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ سفر نامے میں غلط بیانی سے کام لیا جائے لیکن اس مبالغہ آرائی کی بنا پر ہر سفر نامے کو چھوڑ کا پلندہ ہونے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی ایک سفر کی طرح گزر رہی ہے۔ اسی لیے سفر حیات کو گزارنے کے لیے اسے طرح طرح کے طریقے اپنانے پڑتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جب انسان ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر کی راہ اختیار کرتا ہے تو اسے اس سفر میں نہ صرف مصیبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں بلکہ حالت سفر میں پیش آنے والی مشکلات کا بہادری سے مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے سفر نامہ مصیبتوں کے بیان اور حالت سفر میں مشکلات کا سامنا کرنے کا ایک ایسا اظہار ہے کہ جس کے ذریعہ سفر کے دوران مشاہدات میں آنے والی تمام اشیاء کا ذکر کیا جاتا ہے۔

بزرگوں کے اقوال اور ان کے کلام کو محفوظ کرنے کا طریقہ قدیم زمانے سے رائج ہے۔ ہر دور میں بزرگان دین اور عقیدت مندوں کی کمی نہیں رہی۔ خدا کے نیک اور بزرگ بندے حالت وجد یا مراقبہ کی حالت میں جو الفاظ کہہ دیتے ہیں انہیں عقیدت مند لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے۔ یہ طریقہ قدیم زمانے سے رائج رہا اور اس قسم کی تحریروں کو اردو زبان میں ملفوظات کا نام دیا جاتا ہے۔ اردو نثر کی یہ ایک ایسی تحریری خصوصیت ہے جس میں اولیائے کرام کے فقرے اور جملے اکٹھا کر کے محفوظ حالت میں رکھے جاتے ہیں اور جس کی عظمت کے سامنے ہمارے سوا احترام سے جھک جاتے ہیں ملفوظ کا لفظ عربی زبان سے اردو میں مروج ہوا جو صیغہ واحد میں مستعمل ہے۔ اس لفظ کی جمع ملفوظات کے لفظ سے کی جاتی ہے جس کے معنی ایسی کتاب جس میں

بزرگوں کی کیفیت لکھی گئی ہو لہ کے ہوتے ہیں۔ عام طور پر ملفوظات کا لفظ بزرگوں کا کلام حدیث بزرگان اور اولیاء اللہ کا کلام کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے مستعمل ہے۔ لغوی اعتبار سے ملفوظات ایسی تحریریں کو کہا جائے گا جس میں بزرگ ترین انسانوں کے فقرے اور جملے تحریری طور پر قلمبند کیے گئے ہوں۔ یعنی خدا کے وہ بزرگ ترین بندے جو عبادت و ریاضت کو اپنا شیوہ بنائے ہوئے ہر وقت خدا کی یاد میں مصروف رہتے ہوں اور ان کی زبان سے کسی خاص موقع پر زندگی اور زندگی کی حیثیت کے بارے میں فقرات ادا ہوں تو ان کے عقیدت مندوں نے انہیں جو کچھ قوں تحریری شکل دے دی۔ اس انداز کو اردو میں ملفوظات نگاری کہا جاتا ہے۔

فنی اعتبار سے ملفوظات ایسے فقرے کو کہا جاتا ہے جو نہ صرف زندگی کے واقعات کو احاطہ کیے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ اس دور کی زبان و بیان کو بھی پیش کرتے ہیں۔ اردو کے ابتدائی مخطوطات کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اولیا اور صوفیانے اپنے بیانیہ جملوں سے نہ صرف خدا پرستی اختیار کی بلکہ انسانوں کے دلوں پر بھی حکمرانی کی، اردو میں ابتدائی طور پر ملفوظات کی طویل فہرست ملتی ہے اور یہ سلسلہ سلسلہ سے جاری رہا ہے۔ سید برہان الدین عالم شاہ، سید محمد راجو قتال، نظام الدین اولیاء سلطان قطب الدین اور سلطان سکندر کی تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو ادب میں ابتدائی طور پر ملفوظات کا سلسلہ جاری رہا۔ جو رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے کتیبہ کی شکل اختیار کرتا گیا۔ اردو ملفوظات کی زبان پر پنجابی، سرانگی، گجراتی، برج بھاشا اور گھڑی بولی کے اثرات بہت واضح ہیں۔

اردو نثر کی ابتداء میں بزرگان دین کے ملفوظات کے علاوہ کوئی اور واضح ثبوت نہیں ملتا کہ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اس دور میں اردو ترقی پا رہی تھی یعنی قدیم دور کے ملفوظات ہی سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ زبان کی ترقی کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ اردو ملفوظات کی تفصیل کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جاہلی لکھتے ہیں۔

”جب ہم شاہ وجہی الدین علوی گجراتی ۱۵۵۳ء تا ۱۵۸۹ء کے ملفوظات فقروں اور فارسی عبارت میں استعمال کیے جانے والے اردو زبان کے الفاظ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی زبان زیادہ صاف نقطہ آتی ہے..... دس و تدریس ان کا پیشہ تھا اور ان کے شاگرد و مرید سارے گجرات میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے مریدوں نے ”بحر الحقائق“ کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں سوال فارسی میں اور ان کے جواب جو شاہ وجہی الدین نے دیئے ہیں

اردو میں ہیں“ لہ

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پندرہویں صدی عیسوی تک ملفوظات کا سلسلہ جاری رہا۔ اردو زبان کی ابتداء میں فارسی تحریروں کے درمیان اردو کے چیدہ چیدہ جملے اور فقرے چست کیے ہوئے نظر آتے ہیں جنہیں ملفوظات کا درجہ حاصل ہے۔ عام طور پر ملفوظات سے مراد ایسے فقرے اور جملے لیے جاتے ہیں جو اردو کے ابتداء کے وقت فارسی تصانیف اور تحریروں میں بیان کیے گئے اردو الفاظ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ملفوظات ایسی تحریریں قرار پاتی ہیں جن میں ایک نئی زبان کا عکس پایا جائے۔ اگر فارسی کتاب میں جو قدیم ہو اردو کے جملے مستعمل ہوں

ادراں کی حیثیت علمی و ادبی اعتبار سے معیاری ہو تو انہیں ملفوظات کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔

فنی اعتبار سے ملفوظات مذہبی تحریروں میں فقرے چست کرنے اور بزرگان دین کے اقوال زرین اکٹھا کرنے کے مفہوم سے وابستہ ہیں ملفوظات بیان کرنے والا انہیں ترتیب نہیں دیتا بلکہ اس کے لواحقین اور اس سے وابستگی رکھنے والے اسے ترتیب دیتے ہیں۔ اس فنی تعریف کے پس منظر میں ملفوظات ایسی تحریریں قرار پاتی ہیں جو کسی بزرگ کی زبان سے ادا ہوتی ہیں اور عقیدت مندوں کے قلم سے تحریری شکل پاتی ہیں۔ درحقیقت ملفوظات نگاری ایک تحریری شکل ہے جو خاص انداز اور خدا پرستی کے جذبہ سے وابستہ ہوتی ہے جن کے ذریعہ انسان اپنی اصلاح کر سکتا ہے۔

ملفوظات نگاری کو ادب میں طرز تحریر کی شکل حاصل ہے۔ اسے صنف ادب کا مقام نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اس میں ادبی ضروریات کی پوری طرح نمائندگی ہوتی ہے کیونکہ ان کی حیثیت جملوں اور فقروں کی شکل میں جیدہ جیدہ کتابوں میں بکھری ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کا ادبی مرتبہ متعین کرنا قطعی ناممکن ہے۔ البتہ یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ملفوظات خالص اخلاقی اور مذہبی اصولوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملفوظات کے ذریعہ خدا سے محبت کے جذبہ کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ یہ طرز تحریر صرف جملوں کی حد تک محدود ہوتی ہے جس سے یہ پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ قدیم دور میں زبان و بیان کی تراش و خراش کس نہج پر تھی۔ اسی وجہ سے ادب میں ملفوظات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ترقی یافتہ قوموں میں ملفوظات قوموں کے مزاج اور ان کے آباد و جداد کے رہن سہن کے علاوہ ان کے اصول زندگی کو بچانے میں فیصلہ کنی رکھتے ہیں۔ اردو ادب میں ملفوظات کے مطالعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس زبان

کی ابتداء میں صوفیا اور علماء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تحقیق کے میدان میں جہاں حوالہ جات اور تحقیقی نوادرات کی پہنچ نہیں ہو سکتی۔ اس مرحلے پر تحقیق کے لیے ملفوظات برطانیہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققین کے نزدیک ملفوظات کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

اُردو میں ملفوظات نگاری کا عہد نویں صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری تک جاری رہا۔ جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو زبان اپنی نودہمیدہ زمانے میں علماء صوفیا اور اولیا کرام کے دامن میں پلتی رہی اور ان ملفوظات کی وجہ سے اُردو زبان کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ جس سے تحقیق کے لیے اُردو زبان و ادب کے آغاز وابتداء کے بارے میں قیمتی مواد دستیاب ہوتا ہے۔

ملفوظات درحقیقت پیرطریقت کی زندگی کا جزو ہوتے ہیں جن کی تاریخی حیثیت اور ان کے وجود کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے علم الدین سالک نے اپنے مضمون "آپ بیتوں کے بعض نمایاں پہلو" میں تحریر کیا ہے۔

"صوفیاء جب ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ اسلام کی سادگی

اخوت اور مساوات بھی لائے وہ جہاں بھی گئے ان کی صحبت میں ہندو

مسلمان اور اچھوت برابر حاضر ہوتے سہتے ان میں سے اکثر کے

اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ دن میں

ایک وقت ایسا آتا جب ایک عام مجلس منعقد ہوتی جس میں ہر شخص

مذہب و ملت کے اختلاف کے باوجود شریک ہو سکتا تھا۔ یہاں

زندگی کے اکثر پہلوؤں پر گفتگو ہوتی۔ کبھی کبھی حالات اور معاشرہ

بھی زیر بحث آجاتا۔ پیرطریقت ان موضوعات پر بڑی بے تکلفی سے

گفتگو کرنا اس کے بعض مرید جو تقرب کا درجہ رکھتے اشارات لکھتے جاتے

گھر جائز انہیں مرتب کرتے اور پھر جب جماعت خانے (خانقاہ) میں اپنے مرشد کے حضور میں یاریابی حاصل کرتے تو اپنے لکھے ہوئے ملفوظات اپنے مرشد کو سناتے۔ اگر وہ کہہ دیتا کہ تم نے میرے مفہوم کو صحیح صحیح بیان کر دیا ہے تو اس کے دوسرے مرید اس کی نقول حاصل کر لیتے اس طرح یہ حلقہ خاص سے نکل کر عوام تک پہنچ جاتے۔۔۔۔۔ ملفوظات میں جہاں ایک صاحب سجادہ کے روزمرہ کے مشاغل کا ذکر ملتا ہے وہاں اس وقت کی سیاست، معاشرت اور لوگوں کی اقتصادی حالت کا علم بھی ہو جاتا ہے اس زمانہ کی تعلیم و تربیت کے بارے میں سب سے زیادہ بیش بہا معلومات ہمیں فقط انہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ان کو پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے فاتح کشور کثا اور شہنشاہ بھی اکثر مشکلات اور پریشانیوں کے وقت انہی بوریا نشینوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔^۱

ملفوظات کوئی منظم اور اصولی طور پر سوانحی خصوصیات نہیں رکھتے۔ لیکن انہیں بھی تذکرے کی ایک قسم اور سوانح کی ترتیب میں اہم مواد تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف قدیم تاریخ کا پتہ چلتا ہے بلکہ قدیم مجلسوں کی تاریخ بھی ملفوظات سے مدون کی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملفوظات کسی بھی ادب کے آغاز اور قوم کے ابتدائی اصول کی نمائندگی کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں جس طرح ایک تذکرہ میں کسی شخصیت کے مشاغل اور اس کی زندگی کے علاوہ کارناموں کا ذکر کیا جاتا اسی طرح ملفوظات میں پیر طریقت کی زندگی کے چند اہم واقعات اور مریدین سے ان کے

تبلیغی طریقوں اور اسلامی زندگی کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے اس اعتبار سے ملفوظات تاریخی نوادرات کی حیثیت رکھنے کے باوجود بھی ادبی طور پر تذکرہ سے رشتہ جوڑے ہوتے ہیں جس میں سوانحی انداز کا جز مختصر طور پر پایا جاتا ہے۔

تذکرے کے انداز اور نقوش ملفوظات میں ذیلی طور پر موجود ہوتے ہیں بالفاظ دیگر ملفوظات پیر طریقت کا مختصر تجزیاتی تذکرہ ہوتا ہے جس میں پیر طریقت کی زندگی سے زیادہ عام لوگوں سے اس کے روابط سے بحث کی جاتی ہے یعنی ملفوظات در حقیقت آہنی تعلقات کو اجاگر کرنے والا ایک تذکرہ ہے۔ اس خصوص میں محمد اہل خاں "ملفوظات آزاد" کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں۔

"ملفوظات سے نہ صرف اس تاریخی دور کی سماجی و سیاسی تاریخ

مرتب ہو سکتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کے دلوں میں کیا کیا خیالات اور سوالات ابھرتے ہیں اور ان کا پس منظر کیا تھا۔"

ملفوظات صحت بنیادی طور پر انسان سے انسان کے درمیان تعلقات ہے بلکہ ایک عظیم آدمی افہام و تفہیم کے لیے جو انداز اختیار کرتا ہے اس کے بارے میں بھی ملفوظات کے ذریعہ ہی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں اس اعتبار سے ملفوظات کو آپسی روابط کا تذکرہ کہا جاسکتا ہے۔ عالمی ادبیات میں ملفوظات کے وجود اور اس پر تحریر کردہ کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے "ملفوظات آزاد" کے دیباچہ میں محمد اہل خاں تحریر کرتے ہیں کہ "ملفوظات کے سلسلے میں بیسیوں کتابیں فارسی اور اردو میں شائع

ہو چکی ہیں۔ انہیں یوں سمجھنا چاہیے کہ جس طرح قدیم زمانہ میں مختلف لوگ کتابت یا روایت کرتے تھے۔ جیسے کاتب الواقدی یا حامد الراویہ کی روایات

اسی طرح فارسی اور اردو میں مختلف اقوال و حکایات کو سن کر نقل کرنے کا نام ملفوظات پر کیا۔ ان ملفوظات کی صحت زیادہ تر نقل کی ثقاہت پر مبنی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ملفوظات کی بہت سی قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ اب تک عموماً تصوف و مذہب کے سلسلے میں ملفوظات لکھے ہیں۔ لہ

ملفوظات کے لیے انگریزی کا لفظ *Gospels* استعمال کیا جاسکتا ہے۔ عام طور پر *Gospels* انجیل کے تحریر کرنے والے چار افراد کی تحریر کی نمائندگی کرتا ہے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ارشادات کو *Matthew* کے علاوہ *Mark*، *Luke* اور *Johan* نے تحریر کیے جو انجیل کی شکل میں ظاہر ہوئے چونکہ ان اشخاص نے زبانی تحریر کے طریقہ کو عقیدت مندی کے طور پر کتابی شکل دی۔ اسی لیے اردو لفظ ملفوظات کا متبادل *Gospels* ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اردو ملفوظات میں بھی مرشد سے عقیدت کا رجحان نمایاں ہوتا ہے۔

Gospels کا لفظ لاطینی زبان کے لفظ *Evangelium* کا انگریزی ترجمہ ہے۔ *Gospels* کا لفظ قدیم انگریزی میں استعمال ہوتا آیا ہے۔ جو *Gospels* کی ترکیب کا نمائندہ *God* یہ معنی خدا اور *spel* یہ معنی *Story* یا کہانی کے لیے جائیں گے۔ لہ اس طرح *Godspel* کو مخفف کر کے *Gospel* لفظ کو رواج دیا گیا۔ جس کے معنی خدا کی کہانی کے ہوتے ہیں۔ لیکن دورِ جدید میں روحانی اور مذہبی شخصیات کے ارشادات کو تحریر کرنا *Gospels* کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

لہ ملفوظات آزاد مرتبہ محمد اجمل خاں ص ۷۷ اور ص ۷۸ مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاؤس

Chamber's Twentieth Century Dictionary page 451

Concise Oxford Dictionary page . 530.

ملفوظات ایک تحریری روایت ہے جس کے ذریعہ تاریخ اور سوانح کا مواد جمع کرنے کے لیے قدیم نوادرات کا ثبوت ملتا ہے۔ ملفوظات کو ادبی حیثیت نہیں دی جاسکتی لیکن ادبی متن کی تحقیق میں ملفوظات کا کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ جس مقام پر تاریخ اور قدیم روایات ثبوت فراہم کرنے کے معاملہ میں دم توڑ دیتے ہیں۔ وہاں ملفوظات اپنی خصوصیات کی وجہ سے تاریخی اور سوانحی مواد کے لیے عینی گواہ کا فرض ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اور ادب میں ملفوظات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ملفوظات کے متبادل لفظ *gospels* کی فنی اور ادبی تعریف کرتے ہوئے انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں تحریر کیا گیا ہے:

The oral Gospel was not preached in order to give historical or even biographical information neither did the Gospel literature as the final built of early christain preaching come into existence in the interests of history in the modern scientific (objective) science of that word. The tradition behind the Gospel was sustained at every stage for the sake of preaching and edification, with apologetic and theological modification. The gospels and the tradition behind them had a religious purpose. Nonetheless, there

some material of historical value in them. Not only do they attest the fact that Jesus was truly a historical, but also they include several historical "blocks" that are not entirely dissolved by theological interpretation. The passion narrative, for eg. and many of the sayings and parables (especially these that show series unique escha to logical consciousness.) Thus the venture of writing a life of Jesus" remains a legitimate task for the historian.

But for understanding of the character of the Gospel it is important to recognize that even such historical data were handed down only as they served theological purposes and not for their own sake. This doesn't suggest that the essence of the gospels is spiritual

information or "enternal truth" as opposed to history. Rather it is announcement that revelation has come as the Jesus of history. The Gospels present this historical revelation in its true meaning, i.e. history in its real, theological dimension, history and theology.

Johan's Gospel always presents the material with its own peculiar interpretation, adding discourses from traditions that have no parallel in synoptic Gospels.

انسائیکلو پیڈیا کے مرتبین نے Gospels یا ملفوظات کو عقیدت مندانہ نظر قرار دیا ہے اور اس کے ذریعہ ایسے مواد کی تشریح کا امکان ظاہر کیا ہے جس کے ذریعہ تاریخی اقدار کی وضاحت ممکن ہے۔ ملفوظات کی مثال دیتے ہوئے یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ یہ درحقیقت اقوال زرین کا درجہ رکھتے ہیں جو حکایتی انداز سے بھی دہنا ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ملفوظات ایسی تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں تاریخی تغیر کو بیان کرتے ہوئے اخلاقی، دینی اور مذہبی اقوال کو کسی اہم شخصیت کی زبان

سے ادائیگی کے وقت تحریری شکل میں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے طغوثات پیر پر طریقت کے ارشادات و اقوال کا پیش بھا جموعہ کہلائے گا۔ جس میں اس دور کی مذہبی، سیاسی اور سماجی تغیر کا عکس ملتا ہے جس کی وجہ سے کسی زبان اور مذہب سے تعلق اور اس کی قدامت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

زندگی کے حالات اور واقعات کو تحریر کرنے کا عمل زبان و بیان کے لب و لہجہ کے علاوہ

سرگزشت

الفاظ کی خاص ترتیب و اظہار سے ہوتا ہے۔ حیات و شخصیت اور کارناموں کی پیش کشی کے مختلف انداز میں "سرگزشت" ایک طرز نگارش کی حیثیت سے اپنا مقام رکھتی ہے۔ تذکرہ نگاری کے فن کی نمائندگی میں یہ اسلوب نگارش خاص انداز اور فکر کی نمائندہ ہے جس کے ذریعہ دل پر گزرنے والے صدمات اور واردات کی پیش کش ممکن ہے۔ اس طرز تحریر کے ذریعہ انسان اپنے دل کی کیفیت اور مخوم و پراگتہ خیالات کے علاوہ اچھے ہوئے حالات کا ذکر کرتا ہے۔ اسی لیے اس طرز اسلوب کو "سرگزشت" کا نام دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ اسلوب بھی ایک قسم کی سوانح ہے لیکن اس کے ذریعہ صرف واردات قلبی کا ذکر ممکن ہے۔ اسی لیے یہ مختلف اسلوب کی نمائندہ ایک علمندہ طرز تحریر قرار پاتی ہے۔

سرگزشت کا لفظ واقعہ، حادثہ یا ماجرہ کے معنی کو ادا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ فارسی زبان سے اردو میں مروجہ اس لفظ کی معنوی حیثیت..... دو الفاظ کی ترکیب سے عمل میں آتی ہے۔ فارسی زبان میں "سر" کے معنی فکر، خیال یا

تذکرہ کا التزام ممکن نہیں۔ اس تقاضہ کے ذریعہ تذکرہ نگار جامع اصول اور نظم و ضبط کے ساتھ تخلص کے حرفِ اول کی رعایت یا حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق حالات اکٹھا کر کے انھیں تذکرہ کی شکل میں پیش کرتا ہے جس سے نہ صرف ترتیب میں اصولوں کی پابندی ظاہر ہوتی ہے بلکہ بآسانی کسی بھی شاعر کے حالات ترتیب کے لحاظ سے معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ تذکرہ میں ترتیب و تدوین کا عمل شاعر یا صوفی کے حالات اور کارناموں کی صحت کا ضامن ہے۔ یعنی تذکرہ نگار جس قدر ترتیب و تدوین میں اصول پسندی سے کام لے گا اُسی قدر اس کا تذکرہ جامع ترین قرار پائے گا۔ کیونکہ اسی عمل کے ذریعہ حالات کی تکرار اور شخصیت سے غیر متعلقہ مواد سے انحراف کیا جاسکتا ہے اس تقاضہ کے ذریعہ فنِ تذکرہ میں ہامیت اور موزوں متن کی پیش کشی کے لیے راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

کلام کی ترتیب فنِ تذکرہ کے چھٹے تقاضہ میں داخل ہے۔ جب تک ادبی تذکروں میں شعراء کے کلام کی ترتیب کو شامل نہ کیا جائے۔ تذکرہ کی حیثیت فنی اعتبار سے موزوں نہیں ہوگی سبھی تذکروں میں صوفی یا ولی کی کرامت کو ترتیب میں شامل کیا جاتا ہے۔ غرض تذکرہ میں لازمی ہے کہ شاعروں کا منتخب کلام اور صوفی یا ولی کے منتخب کرامات یکجا کیے جائیں۔ جب تک اس عمل کی تکمیل نہ ہوگی تذکرہ کا فنی تقاضہ پورا نہ ہوگا۔ جہاں تک کلام کی ترتیب اور کرامات کی پیش کشی کا تعلق ہے یہ تذکرہ نگار کا فرض ہے کہ وہ معیاری اور قابلِ فہم کلام اور کرامات تذکرہ میں شامل کرے۔ معیاری تذکرہ کی یہی خصوصیت اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے کہ ان تذکروں میں شخصیت کے حالات کافی جامع پڑتال کے بعد پیش کرنے کے علاوہ ان تذکروں میں شاعروں کا معیاری کلام شامل کیا جاتا ہے۔ اکثر تذکرے اس وجہ سے ادبی طور پر غیر معیاری قرار دیئے گئے کہ ان میں پیش کردہ منتخب کلام ترتیب کے اصولوں

کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ غرض ادبی تذکرہ میں معیاری کلام منتخب کرنا ایک ضروری شرط کا درجہ رکھتا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ ہر شاعر کا کلام اس طرح انتخاب کیا جائے کہ جس کے مطالعہ سے فن کی تمام خوبیاں اور خامیاں واضح ہو سکیں۔ یعنی انتخاب کے دوران کلام کے محاسن اور معائب پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ صرف معیاری یا غیر معیاری اشعار کی پیش کشی انتخاب کے صیغہ میں نہیں آتی اور یہ ترتیب کے اصولوں کے مغاثر ہے اس لیے تذکرہ نگار پر لازم ہے کہ وہ غیر جانب داری سے انتخاب کے تقاضہ کو پورا کرے۔ فن تذکرہ کا ساتواں تقاضہ تذکرہ کے اسلوب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جس کے ذریعہ تذکرہ نگار وقائع نویسی، رنگین بیانی اور عبارت آرائی سے پرہیز کرتے ہوئے سادگی اور پرکاری کے دلکش انداز تحریر سے تذکرہ کو مزین کرتا ہے۔ تذکرہ کے اسلوب کیلئے لازمی ہے کہ ایسا انداز اختیار کیا جائے جو نہ صرف واضح ہو بلکہ دل چسپی برقرار رکھنے کا سبب بھی بنے تمام کامیاب ادبی اور مذہبی تذکرے ان خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ان کا مرتبہ کافی بلند ہے۔ تذکرہ میں اسلوب کے دوران تدریجیہ بیانی نہ صرف فنی طور پر تذکرہ کو غیر معیاری بنا دیتی ہے بلکہ اس کے ذریعہ تذکرہ کے تقاضہ کی تکمیل بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دقیق قسم کے تذکرے اپنی ثقالت کی وجہ سے اردو ادب میں غیر معرود ہونگے۔ جن تذکروں میں ان سات آفت ضل کی تکمیل نظر آتی ہے وہ فنی طور پر تذکرہ کے ضمن میں شمار کیے جائیں گے۔

کسی زبان میں ادب کے آغاز کے ساتھ ہی اس کی اصنافِ نثر میں پیش کردہ متن پر مباحث کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔

تذکرہ کا لزوم

چنانچہ تاریخ، سیرت، وقائع اور توڑک یہ ایسے متبادل الفاظ رہے ہیں۔ جن کے بارے میں طویل بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ عام طور پر سیرت، وقائع اور توڑک کو ایک ہی سلسلے کی کڑی سمجھا جاتا ہے۔ اس پس منظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس تحریر پر تذکرہ کا اطلاق ہو اس کے

علاوہ کیا صرف ادبی طور پر تحریر کردہ سوانحی کتبوں کو تذکرہ کہا جائے گا۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن پر بحث ضروری ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ کن کتابوں پر تذکرہ کا فیصلہ صادر کیا جائے گا۔ بعض ناقدین نے صرف ادبی تذکروں کو "فنی تذکرہ" کے ضمن میں شامل کیا ہے اور بعض ناقدین مذہبی تذکروں کو ادب میں شامل نہیں کرتے۔ ان حقائق کی روشنی میں لازمی ہے کہ ان خصوصیات کا جائزہ لیا جائے جنہیں بنیاد بنا کر کسی کتاب کو تذکرہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ عام طور پر ایسی تمام تحریریں تذکرہ کے ضمن میں آئیں گی۔ جن میں ایک سے زائد شخصیات کے حالات اور کارنامے اکٹھا کر کے کتابی شکل میں جمع کر دیئے گئے ہوں۔ اس عمل کے لیے لازمی نہیں کہ وہ شخصیتیں صرف ادبی حیثیت کی حامل ہوں بلکہ مذہبی، سیاسی، سماجی ثقافتی غرض ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے متعدد افراد کے حالات اور کارنامے کسی ایک کتاب میں جمع کر دینا "تذکرہ" کہلاتا ہے۔ اس تعریف سے تذکرہ کی حیثیت واضح ہو گئی۔ چنانچہ ایسی تمام کتابیں تذکرہ کے ضمن میں آئیں گی جو کسی ایک فنی یا ماہر متعدد شخصیتوں کے حالات اور کارناموں کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہیں۔

کسی تحقیقی کتاب جس میں متعدد شخصیتوں کا ذکر ہو اور ان کے حالات اور کارنامے بھی پیش کیے جائیں تو اسے تذکرہ کے ضمن میں شامل نہیں کیا جائے گا کیونکہ تذکرہ کا لزوم ایسی کتابوں پر ہوتا ہے۔ جن میں حالات اور کارنامے بیان کرنے کے دوران غیر معتبر اخذات اور مشکوک مواد درج کیا جائے۔ چونکہ تحقیقی کتابوں میں معتبر اخذات اور جامع مواد موجود ہوتا ہے اسی لیے ان کا شمار تذکرہ میں نہیں کیا جاسکتا۔ اس علی ثبوت سے اندازہ ہوتا ہے کہ متعدد شخصیتوں کے بارے میں سوانحی مواد پیش کرنے والی ہر کتاب پر تذکرہ کا لزوم نہیں ہوتا بلکہ ایسی کتابیں ہی تذکرہ کے ضمن میں آئیں گی جن میں حالات اور واقعات کی پیش کشی کے دوران تحقیقی

اندازِ روانہ رکھا جائے بلکہ تاریخِ ادب و مذہب کی ترتیب کی غرض سے کچھ اہم ادبی و مذہبی شخصیتوں کے حالات یکجا کر دیئے جائیں اس پس منظر میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تذکرہ نگاری کے دوران مواد کی فراہمی کو اولین درجہ نہیں دیا جاتا اور نہ ہی شخصیت کے حالات جمع کرنے کے لیے کد و کاوش کی جاتی ہے بلکہ ذیلی طور پر علم میں آنے والے حالات و واقعات ہی کو مرتب کر کے اسے تذکرہ کی شکل دے دی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے تذکرہ میں جامع مواد کا نہ ہونا اس کی خصوصیات میں شامل ہے فنی طور پر تذکرہ کا اطلاق ان کتابوں پر بھی ہو گا جو کئی شخصیات کے حالات بیان کرنے کی بجائے صرف شخصیتوں کی تاریخ پیدائش اور وفات درج کرنے کے بعد صرف ان کے کارنامے بیان کرنے پر اکتفا کرتی ہوں اگرچہ ان تذکروں میں شخصی حالات درج نہیں ہوتے لیکن صرف اس بنیاد پر تذکروں کے فن میں شامل ہیں کہ ان کی وجہ سے کسی عہد میں موجود مختلف فنون میں ماہر شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں کا علم ہوتا ہے۔ عام طور پر کن میں ایسے متعدد تذکرے لکھے گئے جن میں صرف مذہبی شخصیتوں کے نام، تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور تاریخ عرس وغیرہ درج ہیں۔ چونکہ یہ کتابیں دورِ جدید میں علماء، صوفیاء، اولیاء اور شعراء کی تاریخ ترتیب دینے میں مدد دیتی ہیں۔ اسی لیے ان پر بھی تذکرہ کا لزوم ہوتا ہے۔

شاعروں اور ادبی کارنامے انجام دینے والے اشخاص کے حالات اکٹھا کر دینا ہی تذکرہ میں شامل نہیں بلکہ فنی تذکرہ کا اطلاق ان تمام ادبی، مذہبی اور دیگر شعبہ حیات کے کارکنوں کی تفصیلات جمع کرنے والی کتابوں پر بھی ہو گا جو مستقبل میں تاریخ کی ترتیب میں مدد دیتی ہوں۔ اس لحاظ سے تذکرہ کا لزوم صرف ادبی سوانح پیش کرنے والی کتابوں پر نہیں ہو گا بلکہ زندگی کے تمام طبقے اور شعبہ حیات سے متعلق افراد کے

حالات اور کارناموں کو کتابی شکل میں ترتیب دیتا تذکرہ کہلائے گا جس میں تحقیقی عمل کا رونا نہ ہو اور تدوینِ متن کے دورانِ روادری سے کام لیا گیا ہو۔ غرض تذکرہ ایک ایسا عمل ہے جو بذاتِ خود ترتیب کا کام انجام دینے کے ساتھ ساتھ مستقبل میں تحقیقی ترتیب کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتا ہے۔ تذکرہ عملی طور پر سوانح نہیں اور نہ ہی تاریخ ہے۔ اس کا شمار دقائق اور توذک میں بھی نہیں ہوتا بلکہ تذکرہ کو انتخابی سوانح کا نام دیا جاسکتا ہے اور ایسی تمام کتابیں جو شخصی حالات اور کارنامے ترتیب دینے کا حق ادا کرتی ہیں۔ فنی اعتبار سے تذکرہ کے ضمن میں آتی ہیں۔

ادبی تحریروں میں تذکرہ، ترتیب یا انتخاب کے عمل کی نامزدگی کرنے کی وجہ سے ایک فن کا درجہ رکھتا ہے

تذکرہ کی جدیدیات

لیکن تذکروں کے مطالعہ کے بعد ناقدین اور محققین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تذکرہ کو تخلیق کا درجہ دیں یا تالیف کی حیثیت سے اس کا مرتبہ متعین کریں۔ عموماً ہر تذکرہ میں اس کے مزاج، موضوع اور مواد پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اور ہر تذکرہ نگار اپنے قلم کے ذریعہ موزوں شخصیت کے ادبی مزاج یا پھر اس کی مذہبی کارکردگی کے ساتھ ساتھ سوانح بھی پیش کرتا ہے۔ تذکرہ کے ان عوامل کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ ایک انتخابی عمل اور ترتیب کی خصوصیت رکھتا ہے۔ درحقیقت ترتیب کا عمل تالیف کا درجہ رکھتا ہے۔ تذکرہ کی حیثیت تصنیف کی نہیں اور نہ ہی اسے غیر تخلیقی کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ تذکرہ نگار صاحبِ شخصیت کی سوانح اور کارنامے بیان کرنے کے دورانِ تخلیقی عمل کا سہارا لیتا ہے اور بغیر اس تخلیقی قوت کے تذکرہ کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس لیے تذکرہ تالیفی خصوصیت کا متحمل ہونے کے باوجود تخلیقی خصوصیت کا بھی حامل ہے جس کے نتیجے میں تذکرہ ایک ایسی صنف قرار پاتا ہے جس میں تصنیف و تالیف کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ تخلیق کے عوامل بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔

مواد کے اعتبار سے تذکرہ کا مزاج سوانحی ہے یعنی تذکرہ میں شاعر یا صوفی کے حالات بیان کرنے کے دوران سوانحی خط و خال کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور تذکرہ نگار اپنی تحریر کی جولانی سے سوانحی مواد میں تخلیق کی خصوصیت کو اس طرح شامل کرتا ہے کہ تذکرہ میں ایک سے زائد شخصیات کی سوانح ہونے کے باوجود ترتیب کے دائرہ سے علیحدگی اختیار کر کے تالیف کے صیغہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر کسی بھی موضوع یا عنوان پر متن کی ترتیب کا عمل "تالیف" کے شعبہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور یہ عمل انتخاب کی خصوصیت سے مزین ہونے کی وجہ سے تالیف ہونے کی عام صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ یعنی کوئی بھی کتاب جس میں ترتیب اور انتخاب کا عمل کارفرما ہوگا اسے تالیف کا درجہ دیا جائے گا۔ لیکن تذکرہ میں شعراء کے حالات کی ترتیب اور ان کے کلام کا انتخاب ہونے کے باوجود اس کا شمار ترتیب میں نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ترتیب میں متعدد اشخاص کے منتخب موضوعات کو جگہ نہیں دی جاتی جبکہ تذکرہ میں منتخب موضوعات کا نہ صرف عمل دخل ہوتا ہے بلکہ متعدد شعراء کے حالات اکٹھا کر کے تذکرہ نگار انہیں اپنی تخلیقی صلاحیت کے ذریعہ کتابی شکل میں ترتیب دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرہ میں ترتیب و انتخاب کا عمل کارفرما ہونے کے باوجود اسے تخلیق کا درجہ حاصل ہے۔

فنی اعتبار سے تذکرہ کی جدلیاتی حیثیت ایک تخلیقی عمل کہتا ہے کیونکہ جب تک تذکرہ نگار کے ذہن میں شاعروں کی زندگی یا صوفیاء یا اولیاء کی کرامات کا خاکہ نہیں ہوگا اس وقت تک تذکرہ کی تحریر کا عمل بے سود رہے گا اور تذکرہ نگار لاکھ چاہتے ہوئے بھی کتاب تحریر نہ کر سکے گا جبکہ ترتیب کے دوران ذہن میں کسی قسم کا خاکہ مرتب کیے بغیر چند موضوعات کو اکٹھا کر کے کتابی شکل دی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ترتیب کے لیے چند کتابوں کے اقتباسات کا سہارا لیا جاتا ہے جبکہ تذکرہ نگاری کے دوران

اقتباسات سے مدد تو لی جاسکتی ہے۔ لیکن ان پر مکمل تکیہ نہیں کیا جاتا بلکہ تذکرہ نگار چند اہم کتابوں سے شخصیت کے سوانحی حالات اپنے ذہن میں محفوظ کر کے انہیں اپنے تخلیقی سرچشمہ کی بنیاد پر مرتب کرتا اور تحریر کی زد میں لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرہ میں ترتیب کی خصوصیت ہونے کے باوجود یہ تخلیقی سرچشمہ کا نمائندہ ہے۔

عملی مواد اور اسلوب کی بنیادوں پر تذکرہ کی حیثیت تالیف کی ہے۔ تذکرہ میں سوانحی حالات اور انتخاب کلام کے سوا کچھ نہیں۔ جس کے ساتھ ہی تذکرہ نگار کو اپنے اسلوب کے جوہر دکھانے کے بہت کم مواقع ہیں۔ نیز اردو کے اکثر تذکروں میں شاعریا صوفی کی شخصیت کے بارے میں متن کی حیثیت ذیل میں آتی ہے۔ یعنی تذکرہ نگار سوانحی خاکے نہیں بناتا بلکہ شخصیت کی زندگی کے حالات کے چند اہم کارنامے ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ جس میں اسلوب کی تلاش اور اس کی منفرد مزاجی کو ٹوٹا ایک مشکل امر ہے۔ کیونکہ تذکرہ نگار شخصی حالات کے دوران ایجاز و اختصار سے کام لیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تذکرہ میں اکثر شخصیت کو حالات کی لمبیٹ میں بتایا جاتا ہے جو تخلیقی کارنامے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ایسا فعل ترتیب میں اختیار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ تالیف کے انتخاب اور ترتیب کے دوران مؤلف کو اپنے قلم کی جادو نگاری دکھانے کا موقع نہیں ملتا اور تذکرہ میں چونکہ تذکرہ نگار کو اپنے تخلیق کے گوشوں کو واضح کرنے کی پوری سہولت دی جاتی ہے اور تذکرہ نگار اسے اپنی مرضی کے موافق استعمال کرتا ہے۔ اسی لیے تذکرہ فنی طور پر تخلیق کا درجہ رکھتا ہے اور اس فن میں ترتیب اور انتخاب کی خصوصیت ہونے کی وجہ سے یہ مکمل تالیف ہونے کی دلالت کرتا ہے۔

فن اور فن کی جانچ کے پس منظر میں جب تنقیدی رویہ

تذکرہ کا معیار | اختیار کیا جاتا ہے۔ تو سب سے پہلے فن کے معیار سے بحث کی جاتی ہے۔

ادبی طور پر تذکرہ ایک فن اور تخلیقی صلاحیت قرار دیئے جانے کے بعد اس کے معیار اور مسائل پر بحث بھی لازمی ہے۔ ناقدین اُردو ادبی طور پر کسی ایک تذکرہ کو اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں جبکہ دوسرا تذکرہ ان کی نگاہوں میں جھپٹے نہیں پاتا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک تذکرہ کا معیار نہ دیکھا جائے اس کی حیثیت اور مرتبہ کا تعین مشکل ہو جاتا ہے۔ فنی طور پر ہر تذکرہ اپنا معیار رکھتا ہے اور اپنے مخصوص مزاج اور ماحول کے ساتھ عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔ فن اور معیار کے پس منظر میں تذکرہ تخلیقی چشموں تصنیف، تالیف اور ترتیب جیسی خصوصیات میں تالیف کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک عمدہ تالیف کی حیثیت سے تذکرہ کا معیار متعین کرنا ابی جائزے کے مترادف ہے!

ادبی، سیاسی اور مذہبی طرز و انداز کے نامزد تذکروں کا معیار مختلف کی جہت پر منحصر ہوتا ہے۔ تذکرہ کے معیار کو جانچنے کے لیے بیان، متن اور ترتیب کے طریقہ کار سے بحث کی جاتی ہے۔ جس تذکرہ میں بہترین بیان، جامع متن کے ساتھ ترتیب کا اٹوٹکا انداز روارکھا جائے وہ فنی طور پر معیاری تذکرہ قرار پائے گا۔ ان اصولوں سے کمتر درجہ کے تمام تذکرے اگرچہ فنی لوازمات کی پابجائی کریں گے۔ لیکن معیاری نہیں قرار دیئے جاسکتے۔ ہر دور میں متعدد تذکرے لکھے گئے لیکن ان تمام تذکروں میں انفرادی حیثیت کا حامل تذکرہ ہی معیاری قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جس تذکرہ نگار نے اصول تدوین کو پوری طرح سلوک میں لایا وہی کامیاب تذکرہ نگار قرار دیا گیا اور اس کا تالیف کردہ تذکرہ فنی اور ادبی طور پر معیاری تذکرہ کے ضمن میں شمار کیا گیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ نامزد تذکرے فنی معیار کے متقاضی ہوتے ہیں اور جن تذکروں میں اس معیار کی پابجائی نہیں ہوتی۔ وہ تذکرے کے فنی معیار پر پورے نہیں اُترتے۔

تذکرہ کے معیار سے مراد اس فن کو بلند ی پر پہنچانے کے لیے اختیار کردہ وہ عمل ہے جو تذکرہ کے دوران اختیار کیا جاتا ہے۔ عام طور پر فن کی اصولی ترتیب ہر تذکرہ میں پائی جاتی ہے۔

اور ہر تذکرہ اسی مقصد کے تحت لکھا جاتا ہے کہ اس میں تذکرہ کے فن کے تمام اصولوں کو بروئے کار لایا جائے۔ لیکن بہت کم تذکرے ایسے ہوتے ہیں جو اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ فنی طور پر تذکرہ کا تمام اصولوں کی پابجائی کرنا تذکرہ کا معیار کہلائے گا۔ اور اسی معیار کی بدولت تذکرہ کی جانچ پر طال کی جاتی ہے۔ چونکہ تذکرہ تصنیف اور ترتیب سے ہنگر تخلیقی سرچشمے تالیف سے متعلق ہے۔ اسی لیے اس کے معیار کی جانچ کے لیے تالیفی اصولوں کو رد کر دیا جاتا ہے۔ جس تذکرہ میں ترتیب کا بہترین طریقہ جامع سوانحی محاذ اور موزوں زبان و بیان کا سہارا لیا جائے۔ وہ نہ صرف معیاری تذکرہ کہلائے گا بلکہ اس کی درجہ سے ادب میں بھی اضافہ ہوگا۔

تذکرہ کے فنی جائزے میں جہاں اس کے فن سے معلومات حاصل کی جاتی ہیں وہیں تذکرہ کے تقاضے کے علاوہ تذکرہ کے اطلاق اور اس کی جدلیاتی حیثیت سے بھی بحث کی جاتی ہے۔ جب ان تمام خصوصیتوں کی بھلک تذکرہ میں موجود ہوگی تو معیاری طور پر اس تذکرہ کا مرتبہ بلند ہوگا۔ اور فنی اعتبار سے تذکرہ کی ہیئت بھی سامنے آئے گی۔

ہستی اعتبار سے ادب کی تمام اصناف تخلیقی رجحان کی ترجمان ہوتی

ادب میں تذکرہ کا مرتبہ

ہیں۔ داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ اور شاعری کے تمام اصناف تخلیقی سرچشمے ہیں۔ ان کے برخلاف سوانح، تذکرہ، سفر نامہ اور آپ بیتی کا شملہ تالیف میں ہوتا ہے۔ ادبی طور پر تذکرہ کی حیثیت ایک مکمل تالیف کی ہے جس میں بسا اوقات تذکرہ نگار اپنی جدت طبع سے تصنیف کی خصوصیت لانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ترتیب اور انتخاب کے متن کی کثرت کی وجہ سے تذکرہ کو ادبی طور پر تصنیف کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ تذکرہ میں تالیفی خصوصیات پوری طرح موجود ہوتی ہیں۔ سوانح کا بیان اور تذکرہ نگار کا اسلوب اگرچہ تذکرہ کو تصنیف کے قریب کرتے ہیں لیکن تاریخ اور سنہین کے ساتھ ہر سال کے واقعات

اور زندگی کے اہم کارناموں کو پیش کرنے کے دوران تذکرہ نگار، انشا پر داری کے جوہر بھی دکھاتا ہے۔ یہ انداز تذکرہ کو تصنیف سے قربت بخشتا ہے۔ لیکن ترتیب و تدوین کے علاوہ تذکرہ کا بیشتر حصہ انتخاب سے متعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں تذکرہ کا مرتبہ تالیف کی حیثیت سے نمایاں ہے۔

فنی اعتبار سے تذکرہ نگاری ایک مجتمع اور مرکب صنف ہے جس میں انتخاب کی صلاحیت بھی موجود ہے اور ترتیب کا سلیقہ بھی جس کے ساتھ ہی انشا پر داری اور اسلوب کے جوہر بھی تذکرہ کی صنف میں شامل ہیں۔ سوانحی مواد اور تاریخی جائزہ بھی تذکرہ کی صنف کا ایک جز ہے ان ہنر دی خصوصیات کی بنا پر تذکرہ ادب کی ایک صنف ہونے کے علاوہ شخصیت کی ہمہ گیر کو کتابی شکل میں پیش کرنے کا دعویدار بھی ہے۔ اگرچہ شخصیت کے حالات پیش کرنے میں ابجاز و اختصار کی وجہ سے شخصیت کے بعض گوشے پنہاں رہ جاتے ہیں۔ لیکن اس نقص کے باوجود بھی تذکرہ ادبی طور پر ایک صنف کا مرتبہ رکھتا ہے اور یہ ایسی فعال صنف ہے کہ جس کی وجہ سے تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اور عہد قدیم میں شعر گوئی اور شاعرانہ چشمک کے علاوہ مشاعروں کی روایت کے بارے میں بھی تذکروں سے ہی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں تذکرہ کا مرتبہ ایک صنف اور تالیف کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے جس کے ساتھ ہی افادیت کی بنیادوں پر تذکرہ فنی طور پر ادبی تاریخ یا مذہبی تاریخ مدون کرنے کا بہترین اور معتبر ذریعہ بھی ہے۔

باب دوم

تذکرہ نگاری کے اقسام

تذکرہ تحریر کرنے کی خصوصیات میں مختلف اسلوب مروج ہیں۔ ان میں طرز تحریر کے لحاظ سے چیدہ چیدہ فرق بھی پایا جاسکے۔ اگرچہ یہ تمام اسلوبات مکمل طور پر سوانح کے فن سے وابستہ ہیں لیکن ان کی تحریروں کے انداز میں فسوق اور اصولوں کی تبدیلی کی وجہ سے انہیں مختلف عنوانات سے مربوط کیا گیا ہے۔ تذکرہ نگاری کا مقصدی پہلو سماج کی سربراہرہ اشخاص کی زندگی اور حالات کے علاوہ کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی سوانح پیش کرتا رہا۔ لیکن اصول پسندی اور شعوری ارتقاء تکمیلی حیثیت میں نہ ہونے کی وجہ سے سوانح نگاری روایتی طور پر تذکرہ کے رد میں ترقی کرتی رہی اور ہی تذکرہ کا فن مختلف انداز سے اسلوب کو بدلتا ہوا متفرق عنوانات کا حامل رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ”اردو تذکرہ نگاری“ کا تحقیقی و تاریخی جائزہ لیا جائے تو یہ فنی طور پر مختلف اقسام میں تبدیل ہو کر اپنے اسلوب کی علاوہ خصوصیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ تذکرہ نگاری ایک ضمنی صنف کا درجہ رکھتی ہے۔ جس کی جدید ترقی یافتہ شکل سوانح نگاری آج کے ادبیات کی مقبول ترین صنف ہے۔ تذکرہ تحریر کرتے ہوئے اردو کے سوانحی ادب کے معاروں نے علموہ علموہ انداز اور مختلف طرز تحریر کو رد رکھا۔ یہاں تک کہ یہ جداگانہ اسلوب عنوانات کے اعتبار سے منفرد طرز نگارش کا علمبردار قرار پایا۔ اردو تذکرہ نگاری کی ابتداء اور ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ تذکرہ کا فن اگرچہ

ابتدائی طور پر شخصیات و حالات کے ذکر کے لیے مختص رہا لیکن رفتہ رفتہ اس طرز تحریر میں نمایاں فرق محسوس کیا جانے لگا اور پھر تذکرہ نگاری کی مختلف اقسام اور متبادلہ اسلوب سے وابستہ ہو گئی۔

تذکرہ کافن صاحب شخصیت کی زندگی کے حالات اور کارناموں کے پیش کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جس میں تحقیقی اور راستہ دہانی اصول کی کمیابی بری طرح کھٹکتی ہے۔ اور جب یہی تذکرہ شخصیت کے کارناموں اور حالات کو پیش کرتے ہوئے تحقیقی اور حقائق پسندانہ طرز نگارش سے قربت حاصل کرتا ہے تو سوانح حیات کو BIOGRAPHY کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب سوانح حیات کی تحریر میں خود کی زندگی کا عکس ذاتی قلم سے ردینا ہو تو ایسی تحریر "خود نوشت سوانح" یا AUTOBIOGRAPHY کہلاتی ہے۔ جس میں ایک شخص اپنے حالات زندگی اپنے قلم سے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے۔ اگر اس فن تحریر میں حافظہ پر زور دے کر بکھری یادوں کو سوانحی شکل دی جائے تو یہ انداز یادداشت نگاری (REMINISCENCE) کہلاتا ہے۔ عام طور پر روزمرہ حالات تحریر کر کے اسے مبسوط کتاب کی شکل دے دی جائے تو یہ انداز روزنامہ DIARY کہلائے گا۔ انسان کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے سفر کی دشواریوں اور حالات سفر کا ذکر کسی تحریر کی خصوصیت قرار پائے تو اس انداز کو سفرنامہ TRAVELOGUE کہا جائے گا۔ قدیم تحریریں میں کسی فرد کا ذکر یا فنی طور پر کسی اہم واقعہ کی جانب اشارہ ہو تو یہ انداز مفلوظ نگاری GOSPELS کہلاتا ہے۔ اسی طرح انسان اپنے عمر زدہ حالات کا ذکر کسی کے ردیر و کرے تو اس طرز و انداز کو سرگزشت کہا جائے گا۔ اس طرح تذکرہ نگاری کافن ساٹ مختلف انداز تحریر کا نمائندہ ہے۔ جس کو فن اور اصول کی روشنی میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ سوانح نگاری BIOGRAPHY

AUTO BIOGRAPHY

۲۔ خود نوشت سوانح نگاری

(REMINISCENCE)

۳۔ یادداشت نگاری

(DIARY)

۴۔ روزنامہ

TRAVELOGUE

۵۔ سفرنامہ

GOSPELS

۶۔ ملفوظات نگاری

UTTERANCE

۷۔ سرگزشت

سوانح نگاری

انسان کی زندگی کا جائزہ تاریخی اور عہد کی روشنی میں پیش

کرنا ادبی بنیادوں پر خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ عام طور پر جب

کسی انسان کی زندگی کو بحث کا موضوع بناتے ہوئے انسانی زندگی کے اہم مواد کو بیانی

شکل دی جاتے تو یہ اظہار ادب میں "سوانح نگاری" کہلاتا ہے۔ سوانح نگاری نہ صرف

ایک مکمل صنف ہے بلکہ دور جدید کی سب سے کامیاب طرز تحریر کا درجہ رکھتی

ہے۔ ادبی طور پر اردو نثر میں سوانح نگاری کا سلسلہ تذکرے سے جاملتا ہے یعنی اردو

ادب میں سب سے پہلے انسان کی زندگی اور اس کے حالات کو تحریری روپ دینے کے لیے

تذکرہ نگاری کا رواج ہوا۔ اس لحاظ سے سوانح نگاری اردو تذکرہ کی ترقی یافتہ اور

قابل قبول صنف ہے جس نے نہ صرف تذکرہ کی قدامت کو مہیوم کر دیا بلکہ اپنے پس منظر

میں تحقیقی مواد اور سائنسی استدلال رکھنے کی وجہ سے اردو میں تذکرہ نگاری کی صنف معدوم

ہونے لگی اور سوانح نگاری نے عام شہرت حاصل کر لی۔ لیکن اردو کا نقادان حقیقت

سے انکار نہیں کر سکتا کہ اردو ادب کی قدیم صنف تذکرہ کو جدید لوازمات سے آراستہ

کر کے اسے دور جدید میں سوانح نگاری کے فن سے موسوم کیا جانے لگا۔ اس اعتبار سے

سوانح نگاری بنیادی طور پر تذکرے کے فن سے استفادہ کرتی اور اسی فن کی ایک

مستبدلہ صنف ہونے کا درجہ رکھتی ہے۔

سوانح نگاری کسی شخصیت کی داستانِ حیات کو قلمبند کرنے کا ایک

ایسا طریقہ ہے جس میں پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات کو مبسوط شکل دے کر زمانے کے تغیرات، معاشرے کی زبانوں حالی اور رسم و رواج کے رد و بدل کا شخصیت پر اثر بتایا جاتا ہے یا پھر شخصیت کی وجہ سے زمانہ میں رونما ہونے والے تغیرات کو تاریخ اور عہد کے ساتھ بیان کرنا سوانح نگاری کہلاتا ہے یعنی اس فن کے ذریعہ ایک انسان کی زندگی کو دور اور عہد کے بندھنوں میں باندھ کر شخصیت کے زمانہ پر تغیرات اور انقلابات کے شخصیت پر اثرات سے بحث کی جاتی ہے۔ اور انسانی حیات کو قابل قبول بنانے کے لیے شخصیت کے اخلاق و کردار کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے سوانح نگاری ایک ایسی صنفِ نثر ہے جس کے ذریعہ شخصیت کی حیات کو تحریری شکل دی جا کر اس کی زندگی کے قیمتی واقعات کو اصول پسند زندگی کا مظہر بتایا جاتا ہے۔ سوانح عمری اسی وجہ سے قیمتی صنفِ سخن ہے کہ اس کے ذریعہ تاریخ، شخصیت کردار، سیرت اور فطرت کی بھرپور نمائندگی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ جدید میں سوانح نگاری کے فن کو انسانی حیات کی پیش کش کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ فنِ سوانح نگاری کے بارے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ اس فن کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

”سوانح عمری تاریخ کی وہ شکل ہے جو انسانی نسلوں اور گرد ہوں سے نہیں بلکہ افراد سے متعلق ہے یا یہ کہ سوانح عمری ایک انسان کی پیدائش سے موت تک کے افکار و افعال کا بیان ہے یعنی حقائق کے ساتھ کردار اور ذہن کی نشوونما کا مرقع ہے۔ انسان کی شخصیت کی تصویر ہے اور داخلی احساسات کی کہانی ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کی تعریف یہ ہے کہ سوانح عمری بطور ایک ادبی صنف کے افراد کی زندگی کی تاریخ ہے کہ اس میں تین لوازم تاریخ، فرد اور ادب بستائے گئے ہیں۔“

کارلائل کے نزدیک "سوانح عمری ایک انسان کی حیات ہے اسی طرح ایک اور تعریف میں کہا گیا ہے کہ "سوانح عمری ایک انسان کی تاریخ ہے" ان تعریفات سے پتہ چلتا ہے کہ سوانح نگاری بنیادی طور پر کچھ اصولوں کی پابند اور نظریاتی قیود کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ فن مذہبی، اخلاقی، تاریخی اور سائنسی سوانح عمریوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

سوانح نگاری کا موضوع غیر معمولی قوت اظہار اور عظمت کا مثلاًشی ہوتا ہے یعنی سوانح نگاری نہ صرف موضوع کے اعتبار سے غیر معمولی اظہار کی قوت کو برکت دیتی ہے بلکہ شخصیت کے اوصاف اور شخصیت کی عظمت کو بھی بحث کا موضوع بناتی ہے اس لیے سوانح نگاری کو عظیم شخصیتوں کے موضوع گردار اور کارنامے کا مرکب کہا جاتا ہے جس میں آنے والی نسلوں کی دلچسپی کو متحرک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس تحریک کی صلاحیت کو واضح کرنے کے لیے فن سوانح نگاری کا مل طور پر موضوع، مواد اور بیان کی ضرورت کی مثلاًشی ہوتی ہے۔

اس فن میں صرف عظیم شخصیت کی جسامت کو موضوع بحث نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ طیف و نازک احساسات، ہمدردانہ جذبات، زندگی کی پر معنی مسرت اور عملی زندگی میں پیش آنے والی مشکلات اور جدوجہد کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے سوانح عمری عوامی زندگی اور بنی تعلقات کو پیش کرنے والی ایک ایسی تحریر ہے جس میں شخصیت کے حالات اور اس کی زندگی میں پیش آنے والے تمام واقعات کو کتبائی شکل دی جاتی ہے۔ اسی لیے سوانح عمری کو "اڑھولانا ڈولا" تمام اہم واقعات کو پیش کرنے کا فخر حاصل ہے۔ اس طرح سوانح عمری کا فن شخص کی زندگی کی ابتدا سے آغاز کے مراحل طے کرتا ہوا اس کی موت پر اختتامی درجہ کو پہنچتا ہے۔ اس فن میں شخصیت کی حیات کو پیش کرنے والا اپنی تحریر اور اپنے منفرد اسلوب سے فن کو مکمل طور پر ادبی بنا دیتا ہے یعنی سوانح نگاری کے فن میں صرف عظیم شخصیت کی زندگی اور کارناموں ہی کو اہمیت حاصل

ادبی تاریخ کا نمائندہ ہو جانا۔

اردو کے ادبی تذکرے شعرائے اُردو کی تاریخ مدون کرنے کے علاوہ اردو شاعری کی درباروں تک رسائی کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ شعرا میں آپسی چشمک اور ادبی معرکوں کے بارے میں بھی صرف تذکروں کے ذریعہ ہی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس عمل کے ذریعہ تذکرہ نویس کا مقصد کسی بادشاہ کے دربار کی تاریخ مرتب کرنا نہیں ہوتا لیکن اردو کے ادبی تذکروں کے مطالعہ سے یہ عمل واضح ہو جاتا ہے کہ اُردو شعرا کی درباروں تک رسائی کے وقت ہندوستان میں بادشاہت ایک پُر آشوب دور سے گزر رہی تھی اس کے ساتھ ہی اردو کے ادبی تذکروں کے ذریعہ یہ معلومات بھی حاصل ہو جاتی ہیں کہ بادشاہ ہوا، کے دربار میں کسی قسم کے محرکات غالب تھے۔ اگرچہ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کے عہد کی نمائندگی مختلف تاریخی کتابوں میں بھی ملتی ہے لیکن اردو کے تذکروں میں لکھنؤ اور دہلی کے دبستانوں نے اردو کی ترقی کے پس پردہ جس قدر عسلیں پھٹیاں کیں ان کا پورا اظہار ملتا ہے۔ دربار کے آداب و مراتب سے لے کر بادشاہ کی علم دوستی اور ادب نوازی کی تمام تر تاریخ صرف اردو کے تذکروں کی مدد سے ہی مرتب کی جاسکتی ہے جبکہ تاریخ کی کوئی کتاب درباروں میں پیش آنے والے ادبی معرکوں کی تفصیلات پیش کرنے سے اور یہ اہم فعل اردو کے ادبی تذکرے انجام دیتے ہیں۔

اردو تذکروں کی فہرست میں چند ایسے تذکرے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن میں تاریخی استدلال کھجاب

سماجی تذکرے

اور ادبی چاشنی زیادہ ہے۔ عام طور پر ایسے سماجی حالات جن میں کسی سماج کے اراکین مصلحین اور ان کے کارناموں کو پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا جاتا ہے۔ سماجی تذکرے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یعنی سماجی تذکرے ایسے تذکرے ہیں جن میں کسی مذہبی

یاد ادبی شخصیت کی سوانح درج نہیں ہوتی بلکہ بھلائی اور مہبود کی غرض سے کام کرنے والے افراد کی سوانح لکھ کر ان کے کارناموں کو سراہا جاتا ہے۔ ایسی شخصیتیں مذہبی بھی ہو سکتی ہیں اور ادبی بھی۔ لیکن ان کے کارنامے مذہب و ادب سے ناگزیر بھلائی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایسے افراد کی زندگی کے بارے میں تذکرے لکھنا سماجی تذکرہ نویسی کہلاتا ہے۔ اسی طرز کی تذکرہ نویسی میں شخصیت پر کارناموں کا اثر غالب رہتا ہے۔ اس لیے تذکرہ نویسی کارناموں کے پس پر وہ شخصیت کو اجلا کر انسا توں کو ترغیب دلاتا ہے کہ وہ بھی فلاح و مہبود کے لیے کام کریں۔ سماجی تذکروں کے لیے یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ کسی مذہب یا ذات سے تعلق رکھنے والے فرد یا افراد کے بارے میں تذکرہ تحریر کیا جائے بلکہ اس اسلوب تذکرہ نویسی کے دوران تمام عالمی مذاہب سے تعلق رکھنے والے مصلحین کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے تذکرے ادبی طور پر ابیت کے حامل نہیں ہوتے لیکن ان کے ذریعہ سماج کی اصلاح ممکن ہے۔ اسی لیے ان تذکروں کے بارے میں بھی گویا تقسیم کے دوران مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اردو تذکروں کی گروہی تقسیم کے دوران حفظ و نصیحت عقائد و فضائل، فقہ و مذہب اور حدیث و روحانیات سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگی کے بارے میں مرتب کردہ سوانحی کتاب کو "مذہبی تذکرہ" کا نام دیا گیا جبکہ ادبی اور علمی تہ کے علاوہ شعرو شاعری اور زبان و ادب سے دل چسپی رکھنے والے افراد کی حیات کے بارے میں تفصیلات درج کرنے والی کتاب کو "ادبی تذکرہ" کے نام سے یاد کیا گیا اور تعلیمی، اصلاحی اور اخلاقی بنیادوں پر کام کرنے والے افراد کی زندگیوں کے بارے میں مرتب تحریر کر کے ان کی سوانح کے بارے میں انتخاب پیش کرنا "سماجی تذکرے" کہلاتا ہے۔

اردو تذکروں میں سماجی تذکروں کا اثر تقریباً گم نام رہا کسی بھی تذکرہ نویس نے اس طرز پر قدیم دور میں سوانح مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دور قدیم میں مذہب اور

ادب سے لگاؤ کی وجہ سے عام مذہبی اور ادبی شخصیتوں کو جنہوں نے سماجی طور پر بھی کارنامے انجام دیے۔ انہیں ادب اور مذہب میں شامل کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے دور قدیم کے تذکروں کو علمبردار کرنا ایک مشکل امر ہے۔ لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ سماجی کارناموں کا اثر اور انہیں ادب اور مذہب سے علیحدہ کرنے کا تصور دور جدید کی پیداوار ہے جس کی وجہ سے اردو کے قدیم تذکروں میں سماجی تذکروں کا عمل دخل کسی طرح بھی واضح نہیں ہوتا۔ پھر بھی چند تذکرے ایسے ضرور مل جاتے ہیں جن میں ادب اور مذہب سے زیادہ سماجی کارناموں پر زور دیا گیا ہے۔ یہ تذکرے قلمی نسخوں کی شکل میں مختلف کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ فارسی میں اس قسم کے تذکرے کم یاب رہے۔ اردو زبان نے بھی چونکہ تذکرہ نویسی کا فن فارسی سے سیکھا ہے اسی لیے سماجی تذکروں کا شعور اردو تذکروں میں بھی واضح نہیں۔

اردو کے بعض تذکرہ نویسوں نے سماجی کارناموں کو پیش کرنے کے لیے سماج کے چند مشترکہ کارناموں پر تذکرے تحریر کیے جن میں سماج پسند نظریات واضح ہوتے ہیں۔ ابتدائی طور پر اردو میں سماجی تذکروں کی بنیاد مسجدوں اور مندروں کی تاریخ مرتب کرنے سے ہوئی۔ اردو کے تذکرہ نویسوں نے مختلف علاقوں میں موجود مذہبی عبادت گاہوں کے بارے میں تفصیلات اکٹھا کرنے کی بنیاد رکھی جو اخیر میں عبادت گاہوں کے تذکرے کی حیثیت حاصل کرتے گئے۔ درحقیقت اردو میں سماجی تذکرے سروے ریکارڈ یا دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں تذکرہ کی ناسندگی سے زیادہ تاریخی عکس شامل رہتا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ میں اس قسم کے تذکرے کم یاب رہے۔ سر سید احمد خاں نے "آثار الصنادید" لکھ کر اردو میں سماجی تذکروں کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ آثار الصنادید ایک تاریخی نوعیت کی کتاب ہے جس میں اسلاف کی تعمیر کردہ عمارتوں کی تاریخ درج ہے۔ لیکن اسے ایک سماجی تذکرہ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ سر سید نے اس کتاب میں سماج کے عہد رفتہ کے کارناموں

کو سرا ہے کہ یہ دستاویزی حیثیت دے دی ہے۔ آثارالصنادید ایک تاریخی کتاب ہے۔ دہلی کی قدیم عمارتوں کی یاد تازہ کرنے کی وجہ سے اس کتاب میں سماجی تذکرے کے عکس کی نمائندگی ملتی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے گذرے ہوئے سماج کی تعمیر پسندی کا علم ہوتا ہے اور یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قدیم محارروں نے دو تہذیبوں کے امتزاج سے طرز و کی عمارتیں تعمیر کیں چونکہ سماجی تذکروں میں ایک سے زائد تہذیبوں کے امتزاج کو سماجی بنیادوں پر پیش کیا جاتا ہے اور اس کا عکس آثارالصنادید میں موجود ہے اس لیے ہم اس کتاب کو اردو کا بہترین سماجی تذکرہ قرار دے سکتے ہیں کیونکہ سرسید نے اس کتاب میں ہندو اور مسلمان اہل ثروت افراد کی تعمیر کردہ عمارتوں کی تاریخ درج کی ہے جو سماجی اصولوں کی نمائندہ ہے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر آثارالصنادید ایک سماجی تذکرے کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ اردو میں اس معیار کا سماجی تذکرہ ابھی تک نہ لکھا جاسکا۔ ہندوستان میں سماجی تذکروں کو فروغ دینے والے نثر نگاروں میں سید محمد محی الدین کا شمار بھی ہوتا ہے جنہوں نے آثارالادوار "لکھ کر اردو میں سماجی تذکروں کی روایت کو فروغ دیا۔" کتاب الادوار "کی اشاعت عمل میں نہ آسکی۔ یہ مخطوطہ کی حیثیت سے سالار جنگ میوزیم کے کتب خانے میں محفوظ ہے جس کا حوالہ نمبر ۱۰۲۰ ہے۔ اس کتاب میں تاریخی انداز سے سید محی الدین نے پہاڑوں پر قائم مندروں کا ذکر کیا ہے اور مختصر تعارف کے ذریعہ ان مندروں میں موجود مورتیوں کی تاریخ بھی درج کی ہے۔ دو حصوں پر مشتمل یہ کتاب سنہ ۱۹۰۷ء کے بعد تصنیف ہوئی جس کے ذریعہ مصنف نے ہندوستان کی ان دیولوں کا تذکرہ کیا ہے جو پہاڑوں میں پتھروں کو تراش کر بنائی گئی ہیں۔ اس

۱۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست۔ از نصیر الدین ہاشمی

کتاب سے دور قدیم کی صناعی اور قدیم سماج کی مذہب پرستی کا علم ہوتا ہے۔ اگرچہ آثارِ لادوثان ایک تاریخی نوعیت کی کتاب سمجھی جاسکتی ہے۔ لیکن اسے سماجی تذکرے میں اس لیے شامل کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب ان مندروں کا تذکرہ کرتی ہے جن میں سماج کے افراد کی مشترکہ کوشش کو دخل ہے یعنی چونکہ مصنف نے اس کتاب میں مندروں کا ذکر کیا ہے جہاں سماج کے ہر طبقہ کے لوگ بطور عقیدت جاتے ہیں اور یہاں پر کسی قسم کی سماجی تفریق نہیں امیر اور غریب جھوٹا اور اعراض ہر فرد مندر سے رغبت رکھتا ہے اسی لیے آثارِ لادوثان کو ایک سماجی تذکرے کی حیثیت دی جاتی ہے۔ گو کہ اس تذکرے میں ایک مذہب کے افراد کی عقیدت کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اسے مذہبی تذکرے کی نوعیت اس وجہ سے نہیں دی جاسکتی کہ یہ تذکرہ ہندو مذہب کے ہر طبقے کے افراد کی یکجہتی کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو مندر کے سامنے اپنی عقیدت کو پیش کرتے ہیں۔ ہندو مذہب کے ہر طبقہ کی یادگار کی حیثیت سے آثارِ لادوثان ایک اہمیت کی حامل کتاب ہے اسی لیے اسے تاریخ سے زیادہ سماجی تذکرے کی حیثیت سے قبول کرنا ضروری ہے۔

اُردو کے سماجی تذکروں میں چند ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جو سماج کے مختلف طبقات کی نمائندگی ہیں۔ سماجی تذکرے کی تعریف اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ تذکرے درحقیقت کسی قوم یا مذہب کے مختلف طبقات کی یک جہتی کے نمائندہ ہوتے ہیں اور ایسی تحریریں جن میں یہ طبقاتی یا یہی قومی تعلقات کو اجاگر کیا جائے وہ کامل طور پر سماجی تذکروں کی سرشت میں شامل ہوں گے۔ اگر کسی ایک مذہب کی مختلف یادگاروں کو تاریخی شواہد کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لایا جائے تو ایسی مرتبہ کتاب مذہبی تذکرے میں شامل نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اس کا شمار تاریخ میں کیا جائے گا بلکہ یہ کسی قوم یا مذہب کی نمائندگی کرنے کی وجہ سے اور ایک ہی مذہب کے مختلف طبقات کی مذہبی وابستگی کے اظہار سے اس کی حیثیت تذکرے کی ہو جاتی ہے۔ اُردو میں سماجی تذکرہ کا شروع

صرف چند کتابوں کی حد تک محدود ہے۔ لیکن یہ قطعی نہیں کہا جاسکتا کہ اردو کے تذکرہ نویسوں نے سماجی تذکرے نہیں لکھے۔ اتنا ضرور ہے کہ اردو کے سماجی تذکرہ میں ان تمام اصولوں کی نمائندگی نہیں ملتی جو کہ ایک سماجی تذکرہ کی ضروریات ہیں۔ اردو تذکرے مکمل طور پر نہ سہی لیکن جزوی طور پر سماجی تذکروں کی تشکیل کا حق ضرور ادا کرتے ہیں۔ جن میں سماج کا عکس اور اس کی مشغولیات کی پیش کش نمایاں ہے۔

انسائیکلو پیڈیا فی تذکرے | تذکروں کی گروہ بندی میں ایک ایسا طرز بھی شامل ہے جس کے

ذریعہ تذکرہ نگار شاعروں کے تذکروں کے لیے ان کی سوانح کا انتخاب حروف تہجی کے اعتبار سے کرتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا فی تذکرے میں ایسے تمام سوانحی کارناموں کا شمار کیا جاسکتا ہے جن میں تذکروں کا ذکر ابجدی حروف پر ہو۔

انسائیکلو پیڈیا فی تذکرے ان تذکروں کو کہا جاتا ہے جو الف تخلص سے شروع

ہونے والے تمام شاعروں کے تخلص سے لے کر یاہ سے شروع ہونے والے تخلص سے لے کر یاہ سے شروع ہونے والے تخلص کے شاعروں کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں مواد فراہم کرے یعنی ایک ایسی مبسوط کتاب جس میں ترتیب وار شاعرانہ واد کے تخلص کے اعتبار سے الف سے لے کر یاہ تک کی تمام صاحب شخصیت شعرا کی زندگی کے حالات درج ہوں تو ایسا تذکرہ انسائیکلو پیڈیا فی تذکرہ کہلانے کا بعض تذکروں میں تخلص کی ترتیب کے ساتھ ساتھ نام کے اعتبار سے بھی حروف تہجی کی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے اس اعتبار سے انسائیکلو پیڈیا فی تذکرے میں وہ تمام شعراء کے کارنامے اور ان کی زندگی کے حالات پیش کیے جائیں گے جن کے نام یا تخلص کا آغاز الف سے یاہ تک ترتیب وار درج کیا گیا ہو۔

حروف تہجی کے اعتبار سے شاعر وادب کی زندگی کے حالات ترتیب

دینا اور ان کے کارناموں کو اختصار سے بیان کرنا قدیم زمانے ہی سے مجسود و مجروح رہا۔ ایک معنی میں اس قسم کے تذکرے لغت یا قاموس کی ترتیب کو قرار دیتے تھے جس کا مقصد تذکرے کی ترتیب میں سہولت اور قاری کے لیے بیشتر مواد فراہم کرنا ہوتا تھا۔ فارسی میں لغت کی ترتیب کے اعتبار سے بہت سے تذکرے لکھے گئے چنانچہ اردو زبان میں بھی ایسے تذکروں کی کمی نہیں جو انسائیکلو پیڈیا کی اساس پر لکھے گئے ہیں۔ فارسی کے زیر اثر اردو کے تذکرہ نویسوں نے بھی لغوی ترتیب سے تذکروں کی روایت کو فروغ دیا۔ اور اس کے نتیجے میں انسائیکلو پیڈیا کی تذکرے عالم وجود میں آئے۔ عبد الجبار ملک پوری کی کتاب "تذکرہ شعرائے دکن" اسی اصول پر ترتیب دیا ہوا تذکرہ ہے جس میں شاعروں کی سوانح کو حروف تہجی کی ترتیب میں پیش کیا ہے۔ اردو کے بیشتر تذکرے حروف ابجد کی ترتیب کے نمائندہ ہیں۔ میر حسن کا تذکرہ بھی انہی اصولوں کا پابند ہے۔ متعدد اردو کے تذکرے شخصیت کی سوانح بیان کرتے وقت ابجدی ترتیب کو رد کرتے ہیں۔ قدیم دور میں اردو کے جتنے بھی تذکرے لکھے گئے وہ کسی عہد یا زمانے سے متعلقہ شاعروں یا ادیبوں کی زندگی بیان کرنے سے متعلق تھے۔ لیکن جب تذکرہ نویسی ایک فن کی حیثیت سے عام ہونے لگی تو تذکرہ نویس نے شعرائے زندگی اور کارناموں کو عہد وار ترتیب دینے کا بجائے حروف تہجی کی اساس پر ترتیب دینے کا طریقہ اختیار کیا۔ فارسی کے تذکرہ نویس نے "اسی نوعیت سے ترتیب دیا گیا ہے۔ نظام علی حسینی واسطی بکرائی جن کا تخلص آزاد تھا انھوں نے اس تذکرے میں حروف ابجد کی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے فارسی کے ۱۲۷۳ شعرا کی سوانح لکھی۔ اسی طرح "بہارستان سخن" بھی انسائیکلو پیڈیا کی انداز پر لکھا گیا ہے۔ جس کے مرتب میر عبدالرزاق الحسینی الخونی ہیں۔ فارسی کے یہ تذکرے مخطوطات کی شکل میں سلاطین اور جنگ یوزیم لائبریری میں ۵۴۵ھ اور ۵۵۵ھ وغیرہ کے حوالے کے ساتھ محفوظ رکھے گئے ہیں۔ اردو میں انسائیکلو پیڈیا کی اساس پر تذکرہ نویسی کی روایت

کو مکمل طور پر عبد الجبار ملکاپوری نے سلوک میں لایا چنانچہ ان کا تذکرہ "تذکرہ شعرائے دکن" دو جلدوں میں اسی طرز کی عکاسی کرتا ہے۔

اجب دی ترتیب سے لکھے جانے والے تذکرے درحقیقت صاحب شخصیت کی زندگی کے حالات اور کارناموں کو پیش کرنے کے معاملے میں اصول پرستی کے نائمند ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان تذکروں کے ذریعہ کسی دور یا زمانے کی عکاسی نہیں ہوتی بلکہ ایسے تذکروں میں ابتداء سے تذکرے کی تحریر کے وقت تک کے تمام نامور شاعر اور ادیب کے کارناموں کو ترتیب وار پیش کیا جاتا ہے اردو میں ابتدائی طور پر انسائیکلو پیڈیا کی شکل کی کمی کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ ابتدائی عہد میں شعراء کی کثیر تعداد موجود نہیں تھی انسائیکلو پیڈیا تذکرے کی سب سے بڑی ضرورت حروف تہجی کے اعتبار سے شاعروں کی تعداد میں کثرت لازمی ہے۔ اگر شاعروں کی تعداد کم ہوگی تو لازمی طور پر انسائیکلو پیڈیا کی شکل کے اصول کی نمائندگی میں فرق آجائے گا کیونکہ الف سے یاء تک کے الفاظ کو اپنا تخلص بنانے والے شعراء کی سوانح جمع کرنا اردو کے ابتدائی دور میں ایک مشکل کام تھا اسی لیے اردو تذکرہ نویسی میں حروف تہجی کے اعتبار سے کم تذکرے لکھے گئے لیکن شاعروں اور ادیبوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے بعد یہ طریقہ باسانی رد یہ عمل لایا جاسکا۔

اردو کے مذہبی، ادبی اور سماجی تذکروں سے بالکل مختلف انداز انسائیکلو پیڈیا کی تذکرہ کا ہوتا ہے۔ درحقیقت انسائیکلو پیڈیا کی تذکروں میں شخصیت کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان تذکروں میں شاعر یا ادیب کی تاریخ پیدائش، مختلف سنین میں ان کے کارنامے، شعر و ادب سے دلچسپی اور انہیں وفات کے علاوہ ان کا منتخب کلام درج کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد شاعر کی طبعی سوانح لکھنا نہیں بلکہ شاعر یا ادیب کی زندگی پر مختصر لیکن جامع مواد فراہم کرنا ہوتا ہے۔ اسی ایک خصوصیت کی وجہ انسائیکلو پیڈیا کی تذکرے دیگر تذکروں کے مقابلہ میں

ادیت حاصل کر لیتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا کی تذکرہ کی وجہ سے تاریخ کی کوئی سہولتیں فراہم ہو جاتی ہیں۔ یہ بطور حوالہ اس تذکرے کا استعمال کر سکتے ہیں اور صرف شاعر کے نام اور مخلص سے واقفیت کی بنیاد پر انسائیکلو پیڈیا کی تذکرے کو بطور حوالہ استعمال کر کے بڑی ہی آسانی کے ساتھ شاعر و ادیب کی زندگی کے حالات سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی سہولت کی وجہ سے دور جدید میں علم و فن کی معلومات اکٹھا کرنے کے لیے انسائیکلو پیڈیا لکھے جاتے ہیں۔

اردو کے تذکروں میں کسی جامع انسائیکلو پیڈیا کی تذکرے کا ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی اردو تذکروں میں کوئی ایسا باوثوق تذکرہ لکھا جاسکا ہے جو انسائیکلو پیڈیا کے اصولوں کی ترجمانی کرتا ہو۔ دور قدیم کے تذکروں میں تحقیقی مواد اور تنقیدی عکس کی کمی ہے اور جتنے بھی تذکرے لکھے گئے وہ شخصی تذکرے بن کر رہ گئے۔ دور جدید میں ٹھوس تحقیقی بنیادوں پر انسائیکلو پیڈیا کی تذکرے کی روایت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ اردو کے شعرا اور ادیبوں کی سوانح کے بارے میں کوئی ایسی مبسوط کتاب تاریخین اردو کے سامنے رکھی جاتی جو یک وقت اردو کے تمام شاعروں اور ادیبوں کی سوانحی تاریخ پیش کر سکے۔ یہ کام اردو کے انسائیکلو پیڈیا کی تذکرہ ہی انجام دے سکتے ہیں جس کو دور جدید میں سوانحی انسائیکلو پیڈیا کی تذکرے یعنی *Reference books* کا درجہ رکھتے ہیں۔ جن کے ذریعہ علم و فرا معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ یہ تذکرے دور جدید کے تقاضوں کی تکمیل اور موجودہ علمی اور ادبی تاریخ مدون کرنے کا ذریعہ ہیں۔ جو بیک وقت علمی اور تحقیقی معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ادب کی تاریخ، شاعروں اور ادیبوں کی سوانح اور ہر دور و عہد زبان و ادب کی ترقی کے بارے میں مفصل معلومات کے علاوہ ادبی اصناف اور تنقید و نظم کی تشکیل کے بارے میں تحقیقی مواد فراہم کرتے ہیں۔ اس ہر جہتی معلومات کو یکجا کرنے کی وجہ سے انسائیکلو پیڈیا کی تذکرے کسی بھی ادب کی لازمی ضرورت قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

صنفی تذکرے

اردو تذکروں کی گروہی تقسیم کے دوران تذکروں

کی ایک ایسی قسم بھی دستیاب ہوئی جنہیں صنفی تذکرے کا نام دیا جاسکتا ہے۔ صنفی تذکرے ایسے متن یا مواد کی نمائندگی کرتے ہیں جن میں شعراء کی سوانح اصنافِ نثر و نظم کے اعتبار سے ترتیب دی جاتی ہے یعنی اصنافِ شعری جیسے مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، نظم اور غزل جیسے عنوانات قائم کر کے صنفی تذکروں میں مثنوی، مرثیہ گو، قصیدہ گو، نظم اور غزل گو شعراء کی سوانح صنف واری ترتیب سے پیش کی جاتی ہے جس کا مقصد مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے شاعروں اور ادیبوں کی مبسوط سوانح ترتیب دینا ہوتا ہے تاکہ قارئین کو کسی زبان کے ادب میں نمائندہ شعراء کے معیار کا علم ہو سکے۔

صنفی تذکرے فن تذکرہ نگاری کے ایسے تذکرے ہیں جن میں شاعروں اور ادیبوں کی زندگی کے حالات اور کارنامے نظم و نثر کے اصناف کے پس منظر میں درج کیے جاتے ہیں عام طور پر اس طریقہ ترتیب کا مقصد ادب میں کسی صنف کی ترقی اور اس کی ابتدا کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ تذکرے اصنافِ ادب کے بارے میں مختصر لیکن جامع مواد فراہم کرنے کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں جس میں صنف کے بارے میں مواد کے ساتھ ساتھ شاعرا و ادیب کی زندگی کے حالات بھی درج کیے جاتے ہیں تاکہ زندگی و ادب کی ترقی میں حصہ لینے والے مشاعر یا ادیب کی حیثیت سے واضح ہو سکے۔

اگرچہ تذکروں میں اگرچہ مختلف اصنافِ ادب سے تعلق رکھنے والے افراد اور نمائندہ شعراء و ادباء کی زندگی کے بارے میں مواد دستیاب ہوتا ہے لیکن اصنافِ نثر و نظم کی بنیادوں پر تذکرے تحریر کرنے کی روایت اردو میں کم پایاب رہی۔ دورِ جدید کے محققین نے کسی قدر اس جانب توجہ دی لیکن عددِ قدیم میں کوئی ایسا مواد

دستیاب نہیں ہوتا جن میں صنفی تذکرے کی خصوصیات موجود ہوں۔ فارسی میں ایسے کئی تذکرے تحریر کیے گئے۔ سالار جنگ میوزیم لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں کئی ایسے تذکرے موجود ہیں جو فارسی زبان میں تذکرے کی اس روایت کو پیش کرنے کے نمائندہ ہیں۔ خاص طور پر میر عبدالرزاق حسینی لغاٹ ۱۱۸۵ھ مطابق ۱۷۷۸ء کا مشہور مخطوطہ بہارستان سخن "اسی نوع کا ایک اہم تذکرہ ہے جس میں تذکرہ نگار نے گیارہ فصلوں میں صنفی خصوصیات کے اعتبار سے تذکرہ نگاری کی روایت کو پیش کیا ہے۔ مخطوطہ نمبر ۵۵۵ فارسی کی فہرست میں یہ تذکرہ اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے مرتب نے اصناف کی خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس تذکرے کی ترتیب پر خصوصی توجہ دی ہے۔ گیارہ فصلوں کے درمیان کلام منظوم، فن عروض، فن قافیہ، اقسام شعر، استحسان کلام صنائع و بدائع، علم انشاء، درخط، حروف و اعراب اظہار قواعد لغت کے ذریعہ تذکرہ نگار نے پوری طرح صنفی تذکرے کی نمائندگی کی ہے۔

اردو میں اس قسم کے تذکرے کم یاب رہے۔ لیکن دور جدید کے محققین نے اس قبیل کے تذکروں کو رواج دینے کی کوشش کی۔ نصیر الدین ہاشمی کی کتاب "دکنی مخطوطات" پر ادبی مباحث "اردو صنفی تذکرے کی نمائندہ ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی "اردو غزل" تحقیقی پس منظر میں۔ صنفی تذکرے کی نمائندگی کرتی ہے۔ دور قدیم میں تحریر کردہ سید فتح علی حسینی گردیزی کا "تذکرہ ریختہ گویاں" اردو شاعری کی صنف ریختہ گوئی کے شاعروں کے تذکرے کا نمائندہ ہے۔ دور جدید میں تاریخ ادب تحریر کرنے کے دعوے کی وجہ سے صنفی تذکروں میں کسی قدر کمی واقع ہوئی۔ میرے لے کر دتاسی اور کریم الدین کے عہد تک اردو میں جتنے بھی تذکرے تحریر کیے گئے ان میں شاعروں اداویہوں کی زندگی کے حالات تحریر کر کے ان کا منتخب کلام درج کیا گیا۔ صنفی تذکرے میں شاعروں کی سوانح اصناف کی اساس پر درج کی جاتی ہیں کیونکہ دور قدیم میں اردو شاعری غزل اور مثنوی

سے منسلک رہی اسی لیے اردو میں صنفی تذکرے کی روایت عہد قدیم میں نہ پڑ سکی۔ زیادہ تر غزل گوئی کی روایت کا عام رواج رہا اسی لیے اردو کے قدیم تذکرے صرف ادبی بنیادوں پر تحریر کیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ دور قدیم میں صنفی تذکروں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ لیکن موجودہ دور میں تحقیقی نوادرات کی ترقی کی وجہ سے صنفی تذکرے تاریخ ادب کی حیثیت سے تحریر کیے جا رہے ہیں۔ اردو کے صنفی تذکروں کے نمائندہ تذکرہ نگار عبد الغفور نسار اور محسن لکھنوی سمجھے جاتے ہیں جن کے "قطعہ منتخب" اور "سراپائے سخن" کافی مشہور ہیں۔ ان تذکروں کے ذریعہ تذکرہ نگاروں نے قطعہ گوشتا عودوں کو اعضائے جمافی کو بطور ردیف استعمال کیے جانے والے اشعار یا غزلوں کا انتخاب پیش کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو میں صنفی تذکرے بھی تحریر کیے گئے۔ دور جدید میں صنفی تذکروں کو پہنچی تذکرے کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

آئینی تذکرے | فن عروض اور قواعد کے بارے میں تحریر کردہ تمام تذکروں کو اردو تذکروں کی گروہی تقسیم میں آئینی تذکرہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اسی کتاب میں جن میں فن عروض، علم ادب، الفاظ کے محاسن و معائب اور اشعار کے اوزان کے بارے میں تفصیل درج ہو۔ انہیں آئینی تذکرے کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ان تذکروں میں علم بیان اور علم بدیع کا ذکر ہوتا ہے جس کے ذریعہ شاعریا بیب کو اضافات، بحرین اور اوزان سکھائے جاتے ہیں۔ جس کے ساتھ ساتھ الفاظ کے صحیح استعمال کے علاوہ لغظی و معنوی خوبیوں سے واقف کاری کے لیے شاعر کی حرکات اور سکانات اور لے اور ترتیم کے اصول پر وزن کے تعین اور تشخیص کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے۔ درحقیقت آئینی تذکرے نہ صرف فن عروض اور علم بحر کی تاریخ ہوتے ہیں بلکہ ان کے ذریعہ اختصار اور جامعیت کے اصول کی پابجائی بھی ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ آئینی تذکرے شعر کے مختلف ارکان تقطیع ترتیب ارکان کا التزام شعر کے لیے مناسب بحر اور

ارکانِ شعر سے بحث کرتے ہوئے اُردو تذکروں میں قواعد سے غسلک ہو جاتے ہیں اور ایک مختلف قسم کے تذکرہ کی روایت کو فروغ دیتے ہیں۔ فنِ عروض پر تحریر کردہ کتابوں کو ایک تذکرہ کی حیثیت سے اس لیے مقام دیا جاتا ہے کہ درحقیقت اسی کتابوں کے ذریعہ فنِ عروض ہی بحث کے ساتھ ساتھ مستند اور معتبر شعراء کے اشعار کی تاریخِ مدقن کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

اُردو میں آئینی تذکروں کا رواج دورِ قدیم سے ہی رہا۔ مختلف افراد نے شاعری عروض اور بلاغت کے بیان میں تذکرہ نگاری کے فن کو درکار کیا۔ لا تعداد کتب میں آئینی تذکرے کے فن کی نمائندگی کرتی ہے۔ فنِ عروض کی تعریف و توصیف میں لکھی گئی کتابوں میں شیر محمد خاں کی "گلدرستہ گفتار" مخطوطہ کی شکل میں سالار جنگ میوزیم لاہور میں ۲۵۷۷ پر محفوظ ہے۔ اسی طرح مظفر علی خاں اسیر کی کتاب "ذکرِ کامل حیات مترجمہ معیار الاشعار" بھی اُردو کے آئینی تذکروں میں شمار کی جاسکتی ہے جس میں مصنف نے اُردو عروض اور قافی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ مخطوطہ بھی سالار جنگ میوزیم لاہور میں محفوظ ہے۔ شمس الدین فیض کی کتاب "دستور الشعراء و خزینۃ الامثال" بھی اُردو کے محاورے اور فنِ عروض سے متعلق تفصیلی تذکرہ کرنے والی کتاب کا درجہ رکھتی ہے جو مخطوطہ کی شکل میں سالار جنگ میوزیم لاہور میں مخطوطات میں محفوظ کی گئی ہے۔ ان قدیم آئینی تذکروں کے علاوہ دورِ جدید میں فنِ عروض اور صنائع و بدائع پر کئی کتابیں شائع ہو گئیں جو تحقیقی انداز کو پیش کرنے کی وجہ سے آئینی تذکرے کے اصول سے خارج ہو گئیں کیونکہ آئینی تذکرے صرف فن، بحر اور اوزان کے علاوہ محاورات کی تفصیل درج کرتے ہیں جبکہ دورِ جدید کی فنِ عروض پر تحریر کردہ کتابیں کسی قدر تحقیقی مواد کو اپنائے ہوئے ہیں اسی لیے "دہلئے عروض" از منشی سید علی اور خواجہ عشرت لکھنوی کی شاعری پر کتابیں آئینی تذکرے کا درجہ حاصل نہیں کر سکتیں۔

اردو تذکروں کو معن کی پیش کشی کے اعتبار سے انہیں چھ مختلف ناموں یعنی مذہبی تذکرے، ادبی تذکرے، سماجی تذکرے، انسائیکلو پیڈیا کی تذکرے، صنعتی تذکرے اور آئینی تذکرے سے موسوم کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اردو میں تحریر کردہ تذکرہ کی درجہ بندی کا علم ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ درجہ بندی اردو تذکروں کے موضوع اور خصوصیات کی آئینہ دار ہے۔ جس سے فن تذکرہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۳۱

حضرت

دکنی تذکروں کا آغا ز و عہد

دکن میں اُردو ادب اور زبان کا آغاز شمالی ہند سے قبل ہوا جس کے باعث دکن کو اردو کی شروعات میں اولیت کا مرتبہ حاصل ہے۔ دکن میں اُردو کی جو قدیم شکل رائج تھی اُسے دور جدید کے محققین نے دکنی کا نام دیا ہے۔ گوکہ دکنی زبان اُردو سے رابطہ رکھتی ہے۔ لیکن مقامی بولیوں کے اثرات کی وجہ سے دکنی ادب میں کسی قدر عمومیت پائی جاتی ہے۔ اس حقیقت سے انحراف نہیں برتا جاسکتا کہ اُردو کی داغ بیل سب سے پہلے دکن میں پڑی اور اُردو کا ابتدائی ادب "دکنی ادب" کہلاتا ہے۔ اسی دکنی ادب کی وجہ سے اُردو کی لسانی حیثیت متعین ہوتی ہے اصل سے ایک ہندوستانی زبان قرار دینے کے علاوہ اس کے ادب کو اردو کے لیے ابتدائی مزاج بنانے اور اُردو کو فروغ دینے کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

دکنی دور میں غزل گوئی، مثنوی نگاری، قصیدہ گوئی اور مرثیہ کے علاوہ تذکرہ نگاری پر بھی زور دیا گیا ہے۔ دکن میں اُردو کے آغا تہ کے بعد سب سے پہلے شعر و شاعری کا چرچا رہا۔ غزل گوئی اور مثنوی نگاری دکن کی شاعری کی مقبول اصنافِ سخن رہیں۔ شعر گوئی سے دل چسپی کے نتیجے میں دکنی دور اردو نثر میں زیادہ خدمات انجام نہ دے سکا۔ پھر محی لا دجہی کی "سب رس" خواجہ بندہ نواز گیسو داس کی مختار مآثر کتاب "معراج العاشقین" اور دیگر مذہبی رسالوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دکنی دور میں نثری خدمات مذہبی کتابوں اور رسالوں کی حد تک محدود رہیں۔ چند ایک اہم نثری دکنی

داستان، تفسیر، حدیث، اخلاقی رسالے، فنون لطیفہ، قصص، سیرت، مناقب اور تذکرے تحریر کر کے دکنی ادب میں نثری کارناموں کی نمائندگی اس طرح دکن میں اردو کے آغاز و عہد کے طویل دور میں نثری کارناموں کی حیثیت بے مایہ ہے۔ لیکن اس قدیم دور میں نثر کی طرف توجہ دینا بھی کسی کارنامے سے کم نہیں۔

اردو نثر میں دکن نے جو خدمات انجام دیں ان میں تذکرہ نگاری کا فن ایک مخصوص زاویہ کے ساتھ ابتدائی مدارج سے نکل کر ترقی کی راہوں پر طرف گامزن نظر آتا ہے۔ دکن میں تذکرے کی روایت کے آغاز و عہد کو یہاں قائم شدہ مختلف حکومتوں کے دور سے وابستہ کیا جاسکتا ہے۔ دکنی تذکرے ابتدائی طور پر اپنے پورے فنی نقوش کے ساتھ اردو نثر میں اپنا مقام نہیں بناتے بلکہ دکنی میں ابتدائی طور پر تحریر کردہ تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دکن میں بھی تذکرے کا فن فارسی تذکروں سے استفادہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس میں وہ تمام نقائص موجود ہیں جو شمالی ہند کے تذکروں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دکن میں تذکروں کا آغاز عہد عالمگیری کے بعد ہوا۔ اور خواجہ خاں حمید الدین قاضی کا تذکرہ "گلشنِ گفار" شعراے دکن کا پہلا تذکرہ تصور کیا جاتا ہے جو ۱۱۶۵ھ ۱۷۵۲ء میں عالم وجود میں آیا۔ تذکرے کی روایت کو دکن میں فروغ دینے کے لیے جو نمایاں کوششیں کی گئیں انہیں مختلف اقدار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ دکنی تذکروں کا آغاز اداس کا عہد مکمل طور پر دکنی ریاستوں سے منسلک ہے جو بھیمنی سلطنت کے اختتام کے بعد معرض وجود میں آئیں۔ اسی لیے دکن میں تذکروں کے آغاز اور اس کے عہد کو مختلف علاقوں کے اعتبار سے درباروں اور بادشاہوں کے عہد سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ دکن میں تذکرہ نگاری کی روایت کے ادوار حسب ذیل ہیں:

۱۔ قطب شاہی دور

۲۔ عادل شاہی دور

۳۔ نظام شاہی دور

۴۔ برید شاہی دور

۵۔ عالمگیری دور

۶۔ آصف جاہی دور

چونکہ ان ادوار میں تذکرہ نگاری کے فن کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی اور مختلف نثر نگاروں نے دکن کے شعراء کے بارے میں سوانحی مواد دستیاب کر کے انہیں ایک مبسوط کتاب کی شکل میں مرتب کرنے پر خصوصی توجہ دی۔ اس لیے اُردو تذکرہ نگاروں کے آغاز و عہد کو دکن میں چھ ادوار سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس دور میں فارسی زبان میں بھی تذکرے لکھے گئے۔ لیکن انہیں اسی لیے ان ادوار سے بحث کرتے وقت زیر تنقید نہیں لایا جا رہا ہے کہ عنوان کے مطابق دکنی تذکرے زیر بحث ہیں۔

۱۔ قطب شاہی دور:

بھٹی سلطنت کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد دکن میں قائم ہوئے فالی پانچ سلطنتوں میں سے قطب شاہی سلطنت بھی ایک سلطنت ہے جو دکن میں سب سے زیادہ ادبی کارنامے انجام دینے کا سبب بنی یہ سلطنت ۱۵۱۸ء میں قائم ہوئی اور اس سلطنت سے وابستہ بادشاہوں نے نومولود زبان وادب کی ترقی و ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بادشاہوں کے دربار سے اہل کمال اور اہل فن منسلک رہے۔ شاہانہ سرپرستی کی وجہ سے مختلف شاعر و ادیب درباروں سے وابستہ رہے اور بادشاہوں نے انہیں خلعتیں دے کر اعلیٰ منصب پر فائز کیا۔ یہی نہیں بلکہ شاعروں اور ادیبوں نے قطب شاہی دور سے وابستہ ادب اور شاعری کی ترقی و ترویج میں دکنی زبان کے ذریعہ اپنا حق ادا کیا۔ لاتعداد مثنویاں، کئی مایہ ناز کتا ہیں اور متعدد نثری کارنامے

اس عہدے سے وابستہ ہیں قطب شاہی سلطنت کا اختتام ۱۶۸۷ء میں ہوا قطب شاہی بادشاہوں نے گولکنڈہ کو اپنا پایہ تخت بنا کر دکنی سلطنتوں میں بلند مقام حاصل کر لیا۔ مجموعی اعتبار سے قطب شاہی سلطنت ۱۷۹ سال تک قائم رہی اور اس عہد میں غزل، مثنوی، داستان، تذکرہ اور دیگر مذہبی مسائل پر کتبیں تحریر کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نثر کے مقابلے میں نظم کو فروغ حاصل ہوا اور دکنی زبان کو ایک ادبی حیثیت حاصل ہو گئی۔

عہد قطب شاہی میں نثری کارنامے کسی حد تک محدود رہے اردو کی معرکتہ الآراء داستان ملا وجہی کی "سب رس" اسی دور کی یادگار ہے تذکرے کا رواج اس عہد میں خال خال ہی رہا۔ لیکن مذہبی علماء اور صوفیائے مکرام نے وعظ و پسند کے ذریعہ جو خدمات انجام دیں انہیں محفوظ کرنے کا تصور قطب شاہی دور سے وابستہ رہا۔ تذکرہ نگاری کی ابتدائی شکل "ملفوظات" اس عہد میں عالم وجود میں آئی۔ دکنی نثر میں ملفوظات کی حیثیت مکمل فنی نہیں بلکہ فارسی اور عربی تحریر کے درمیان دکنی جملے اور قدیم پنج سے وابستگی رہنے والے ایسے الفاظ اس دور میں تذکرے کی ابتدائی ہیئت کی نمائندگی کرتے ہیں جیسے ملفوظات کا ابتدائی درجہ کہا جاسکتا ہے۔ قطب شاہی دور میں تذکرہ نگاری کی روایت ابھی اپنے آغاز کے دور میں تھی۔ دکنی اصحاب نے پیرو مرشد کے بیانات کو قلمبند کرنے کی روایت کو اس دور میں پروان چڑھایا۔ اور اس انداز کو ملفوظات کی شکل میں نثری حیثیت دی گئی۔ قطب شاہی دربار سے بلند پایہ شاعرانہ ادیب وابستہ رہے۔ اعلیٰ درجہ کی اردو نظم و نثر میں کتابیں لکھی گئیں اور علم و فضل اور شعرو سخن کی قدر و منزلت کی گئی۔ لیکن صوفیا اور مذہبی علماء درباروں سے وابستہ نہ رہے بلکہ انہوں نے دکنی عوام کے دلوں پر حکمرانی کا طریقہ اپنایا۔ چنانچہ سید بلاتی شاہ راجہ میراں جی

خدا نیا، میرا یعقوب، شاہ افضل قادری، شاہ عالم، عرف شاہ سنجہا، شاہ قطب الدین، دیبہ الدین گجراتی، امیر خسرو، خواجہ مسعود سعد، سلمان ابو علی قلندر یانی پتی، شرف الدین بھٹی، میری شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شاہ باہل، قاضی محمود دریاگی علی جوگام دھنی، میرا شمس العشاق اور برہان الدین جانم یہ ایسے صوفیائے کرام تھے جن کے ملفوظات میں تذکرے کی روایت کا عکس ملتا ہے۔ مسئلہ اس سے متعلقہ ہے کہ ملفوظات لغات اور کتبوں سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی "تاریخ ادب اردو میں" تحریر کرتے ہیں کہ:

"تذکرہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں قوالی کا رواج عام

تھا۔ اور یہ قوالیاں عام طور پر ہندوی زبان میں ہوتی تھیں تاکہ ہر طبقے کے لوگ

ان سے کیف و سرور حاصل کر سکیں۔" ۱

قطب شاہی دور میں تذکرے اور ملفوظات کی روایت فارسی کتابوں

میں دیکھی جملے تحریر کرنے سے ترقی پاتی رہی۔ اس دور کے صوفیا اور علمائے دکنی یا ہندی

زبان کو بطور ملفوظات کے استعمال کیا۔ یہ ملفوظات مبسوط کتاب کی شکل میں نہیں بلکہ فارسی

نثر کے دوران دکنی میں تحریر کر دیئے گئے ہیں۔ قطب شاہی دور میں جو فارسی کتابیں تحریر

کی گئیں اور جن میں دکنی الفاظ اور جملے بطور ملفوظات کے استعمال ہوئے ہیں۔ ان کی تفصیل

ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

مرآۃ احمدی:

فارسی میں تحریر کردہ یہ کتاب اگرچہ تذکرہ یا مکمل ملفوظات کا درجہ نہیں رکھتی لیکن اس

۵۔ ”انھوں کو کیا کشف ہوئے یا نہ ہوئے کام اس کا ہے“ لہ
۶۔ قاضی محمود از غلبات عشق پیوستہ بر حسب حال نقوش عاشقانہ بہ عبارت
ہندی در مقامات ہندیہ بطرز دل پسند می بست۔“ لہ

ان جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرآۃ احمدی کی تحریر میں بیان کے دوران
تعداد ایسے جملے بکثرت استعمال ہوئے ہیں جن میں قدیم دکنی کا اثر غالب ہے۔ اس کے
علاوہ یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ فارسی تحریروں کے درمیان دکنی الفاظ اور جملے تحریر
کرنا ایک نئی زبان کی شروعات کی داغ بیل ہوا ہے کرام کی تحریروں سے دکن میں پڑ
چکی تھی۔ مرآۃ احمدی ان دکنی آمیز جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن میں تذکرے کی
روایت ابتدائی طور پر ملفوظات کی شکل میں نمود پاتی رہی اور یہ ملفوظات فارسی تحریروں
کے درمیان رعا رکھے گئے۔ مرآۃ احمدی مکمل طور پر ملفوظات اور تذکرے کی نمائندہ کتاب
تو نہیں لیکن بایر طریقت کے استعمال کردہ جملے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس دور میں تذکرے کی
ابتدائی تشکیل کے لیے ملفوظات نے سازگار ماحول پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ تذکرے کی روایت
اور اس کی ایک ابتدائی نوعیت ملفوظات کی نمائندگی شاہ نمین کی کتاب مرآۃ احمدی میں
ملتی ہے۔

تحفۃ الکرام:

دکنی دور کی یادگار کتابوں میں اس کتاب کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ فارسی میں
رہ کردہ اس کتاب میں دکنی ملفوظات کی جھلک محسوس کی جاسکتی ہے۔ میر علی شیر

قاضی کی یہ کتاب چند ایسے فقہات کی نمائندگی کرتی ہے جن میں ملفوظات کی جھلک نمایاں ہیں۔ ذیل میں تحفۃ الکرام کے چند جملے جن سے ملفوظات کی روایت کو تقویت ملتی ہے بطور مثال درج کیے جا رہے ہیں۔

۱۔ بھائی محمود خوش ہو، اسات تھیں۔ وڑا تساتھیں۔ وڑا ساندے

گھر جلال جہانیاں آیا۔ ۱۰

۲۔ "جو راجن جی کا اونٹ بھایا ہو دے تو تجھ جیسے فقیروں کی برسوں میں

کنا سی کرے۔" ۴۶

۳۔ "ارے میاں! لوگ بولتے کیوں نہیں؟" ۳۵

ان جملوں میں دکنی کی روایت واضح ہوتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ

کافن شروع ہونے سے قبل دکنی زبان میں ملفوظات کی روایت فروغ پا رہی تھی۔ تختہ الکرام میں مستعمل یہ جملے ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ دکن میں قطب شاہی دور کے ساتھ ہی فارسی تحریروں کے درمیان دکنی الفاظ اور جملوں کو ملفوظات کے طور پر استعمال کرنے کا رواج عام ہوا۔

جمعات شاہیہ:

انجمن ترقی اُردو پاکستان۔ کراچی کے کتب خانے میں محفوظ یہ کتاب قدیم دور میں تذکرہ کی روایت کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ کتاب فارسی میں لکھی گئی ہے۔ لیکن ملفوظات کی خصوصیت اس کتاب میں بھی موجود ہے۔ ذیل میں جمعات شاہیہ کی تحریر کے چند ایسے

جملے درج کیے جا رہے ہیں جن میں تذکرہ کی قدیم روایت یعنی ملفوظات کی جھلکیاں ملتی ہیں

۱۔ روز در حجره مشغول۔ حضرت قطبہ در آدم۔ دیدم کہ اضطراب عظیم

می کردند و یہ دست دیوار گرفتہ درون حجره می کردند و ہندیہ، "خجڑ پر میں

کھیر دیا سائیں پر مچکا ہے۔" بر زبان مبارک جاری فرمودند۔" ۱۷

۲۔ آئیں کہ کرجوری کما ہے۔ جوری کا کوری میٹھا لاگے۔" ۱۸

۳۔ تساں راج اسان فوجے یعنی تو بادشاہ دمن وزیر۔" ۱۹

۴۔ کا کافیر دز چنگا ہے۔ کا کا چنگا شد یعنی نیک شد۔" ۲۰

۵۔ پیر ما مرید جوگی ہوا۔" ۲۱

ان جملوں میں فارسی کے دوران دکنی الفاظ کا استعمال یہ ثابت کرتا ہے کہ جماعت

شاہیہ ایک فارسی کتاب ہونے کے باوجود تشرکے دوران اس میں دکنی الفاظ بطور ملفوظات استعمال کیے گئے ہیں جن سے دکنی دور میں فارسی روایت کے ساتھ ساتھ زبان دکنی کے

رواج کا پتہ چلتا ہے۔ اور اس حقیقت سے بھی آشنا ہوتی ہے کہ دکنی دور در حقیقت

ایک ایسا ادبی دور تھا جبکہ کئی زبانیں ایک دوسرے سے مل کر دکن کے علاقہ میں ملفوظات

کے طور پر نشوونما پا رہی تھیں۔ جماعت شاہیہ اسی قبیل کی ایک کتاب ہے جس میں تذکرے

کی قدیم شکل ملفوظات کی مانند ملتی ہے۔

۱۷ جماعت شاہیہ (دلی) ورق ۶۳ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔

۱۸ " " " ۶۱

۱۹ " " " ۱۰۰

۲۰ " " "

۲۱ " " " جلد پنجم بحالہ نصاب ادب جلد ۵۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۳۳

مرآة سکندری

قطب شاہی دور میں دکنی ادب کی روایت کے فروغ میں تذکرے کا فن ابتدائی طور پر ملفوظات کی شکل میں ترقی پاتا رہا۔ یہ ملفوظات فارسی کتابوں کے درمیان مستعمل ایسے جملوں کی شکل میں ہیں جو دکنی زبان میں لکھے گئے۔ اس قسم کی کتابوں میں مرآة سکندری کا بھی شمار ہوتا ہے جس میں فارسی تحریر کے درمیان بیشتر دکنی جملے بطور ملفوظات استعمال ہوئے ہیں۔ مرآة سکندری پہلی بار مطبع فتح الکرم بمبئی سے ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا عہد سلطان قطب الدین سے منسوب ہے۔ اس کتاب کے چند جملے بطور ملفوظات استعمال ہوئے ہیں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ "پڑھ ڈو کرے یعنی بخواں لے پیرک۔" ۱۵

۲۔ "پیری سب کوئی جوڑے۔" ۱۶

اس فارسی آمیز تحریر کے دوران دکنی عبارت سے ثبوت ملتا ہے کہ ابتدائی طور پر دکنی زبان کی روایت فارسی تحریروں میں دکنی جملوں کے استعمال سے فروغ پانے لگی اور یہی انداز ابتدائی طور پر تذکرہ کی بنیاد قرار پایا۔ مرآة سکندری دکنی عہد کے قطب شاہی دور کی ایک ایسی یادگار ہے جس کے ذریعہ تذکرہ کی روایت دکن میں ملفوظات کی صورت میں ظاہر ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ مرآة سکندری میں مستعمل دکنی جملے اس دور کی زبان کے یادگار ہیں جو نہ صرف دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ادبی اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ کافی بلند ہے۔

۱۵ مرآة سکندری ص ۶۵ بارادل مطبع فتح الکرم بمبئی ۱۳۰۸ھ

۱۶ " " " " " "

بحر الحقائق

دکنی میں تذکرے کی روایت کو ملفوظات کی شکل میں پیش کرنے والے ادیبوں میں شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کا شمار ہوتا ہے جنہوں نے اپنی کتاب "بحر الحقائق" میں مذہبی سوالات کے جوابات دکنی میں دیئے ہیں۔ ان کے مریدوں نے "بحر الحقائق" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں سوال فارسی میں ہیں اور جواب جو شاہ وجیہ الدین نے دیئے ہیں اردو میں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی دکنی عہد میں ملفوظات کی نمائندگی کرنے والے ایک منفرد ادیب ہیں ان کا عہد ۱۵۴۲ء سے ۱۵۸۹ء تسلیم کیا گیا ہے۔ درس و تدریس ان کا پیشہ تھا بحر الحقائق میں پیش کردہ جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں ملفوظات ترقی پا رہے تھے جنوبی ہند میں قطب شاہی دور کے توسط سے دکن میں ایک نئی زبان نہ صرف پروان چڑھ رہی تھی بلکہ اس زبان میں تذکرہ کی ابتدائی روایت یعنی ملفوظات بھی تحریر کئے جا رہے تھے۔ بحر الحقائق "میں مستعمل چند جملے یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔

- ۱۔ انہوں کو کیا کشف ہوئے نہ ہوئے کام اس کا ہے؟
- ۲۔ کیا ہوا جو بھوکوں ہوا۔ "بھوگوں موئے تیں کیا خدا کوں اپڑیا۔ خدا کو اپڑنے کی استعداد ہو۔۔۔۔۔"
- ۳۔ جیسی تجلی پکڑے قیسا ارادہ دیوے۔ "اگر عبد کی تجلی پکڑے عبدیت ارادہ دیوے۔"
- ۴۔ عارف اُسے کھویں جو خدا سے بھریا ہوئے۔
- ۵۔ اگر کسی کوں تھوڑی سی صفا ہوئے جو حرام لقمہ کھاوے یا حرام نعل کرے تو تیج پاوے۔ دو بجے بار بھی پاوے تیجے بار بھی

پادے " لہ

ان جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت وجیہ الدین گجداتی دکن کے پہلے ملفوظ نگار ہیں جن کے ملفوظات کو مریدین نے محفوظ کیا۔ یہ نہ صرف دکن کے پہلے ملفوظات کا درجہ رکھتی ہے بلکہ ایک اعتبار سے اُسے اردو کی پہلی ملفوظات کی کتاب کا درجہ بھی دیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں سوالات فارسی میں لکھے گئے ہیں لیکن ملفوظات کی خصوصیت میں یہ اصول کارفرما ہوتا ہے کہ کسی بھی مرشد یا صاحب شخصیت عالم کے وعظ یا زریں اقوال کو اس کے مریدین یا قربت رکھنے والے ضبط تحریر میں لائیں چونکہ "بحر الحقائق" کو حضرت وجیہ الدین کے مریدین نے ترتیب دیا۔ اسی لیے یہ مکمل ملفوظات کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے علاوہ اس کتاب کے ذریعہ دکنی کو یہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے کہ اردو میں سب سے پہلے اسی زبان نے ملفوظات کی رعایت کو فروغ دیا۔

حضرت وجیہ الدین علوی گجراتی کے بیشتر مریدین اس عہد میں گجرات کے علاقہ میں مذہبی خدمات انجام دے رہے تھے۔ مختلف مریدین نے ان کے مختلف ملفوظات کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ایک اور خطوطہ میں شاہ وجیہ الدین علوی کے بہت سے اردو فقرے ملتے ہیں جو فارسی عبارت کے درمیان استعمال میں آئے۔ ان میں سے چند یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

۱۔ رات دن خدا جنوں کی مدح کرے۔

۲۔ نہ نہ۔ یوں تو ذوق نہ ہو دے

لہ بحر الحقائق "ملوکہ افسر صدیقی امرہمی۔ توسط تاریخ ادب اردو۔ اردو اکریمل جالبی مطبوعہ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی۔ جنوری ۱۹۷۷ء ص ۱۱

- ۳۔ انہوں کو کیا فائدہ
- ۴۔ آپیں جھک (جھک) مار کر قبول کرے گا۔
- ۵۔ جب ترقی پکڑیں گے۔ آپیں درس کہیں گے
- ۶۔ آقا شیخ عری کا تقویٰ کہاں میرا مکان کہاں۔
- ۷۔ سب چھوڑ بیٹھے تو شاب فائدہ ہو جاوے
- ۸۔ یک ہوں یا دو ہوں
- ۹۔ ایک گہری ، دو گہری یا چار گہری
- ۱۰۔ تمہی ایہاں رہتے ہو۔
- ۱۱۔ دلیوں کہاں صفتاں ہر تیاں
- ۱۲۔ فقیر پر فرض تو نہیں۔ لہ

شاہ دجیہ الدین علوی گجراتی کے ملفوظات میں مشائستگی نرمی اور گھلاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ "شاہ دجیہ الدین علوی کی زبان "دکن اور گجرات کی زبان کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور یہی ان کے ملفوظات کی تاریخی اہمیت ہے۔" لہ دکن کے ملفوظات میں قطب شاہی عہد سے وابستہ ادیبوں نے فارسی تحریروں کے درمیان دکنی شمالی اور گجراتی الفاظ اور محلی استعمال کر کے مذہبی طور پر اردو میں تذکرہ کی بنیاد رکھی۔ ان ملفوظات کی علمی طور پر کوئی حیثیت نہیں لیکن ان کا مطالعہ اس حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے کہ یہی ملفوظات تذکرہ کو فروغ دینے کا باعث ہوتے ہیں اور ان سے قدیم دکنی کی روایت کے آثار کا یہ پتہ چلتا ہے۔

ملفوظات حضرت سید محمد جوہنپوریؒ

سید محمد جوہنپوری کے ملفوظات اور دوہرے تذکروں میں محفوظ ہیں ۱۵۰۳ء میں ان کا تبلیغی مشن کا ایک کارنامہ وجود میں آتا ہے جسے ملفوظات حضرت جوہنپوری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کا تعلق گجرات سے رہا لیکن ان کے ملفوظات کو دکنی دور میں اس لیے شہر کیا جاتا ہے کہ قدیم دور میں گجرات دکن کا ایک حصہ تھا۔ ان کے ملفوظات کے چند جملے درج ہیں۔

۱۔ اچھے جی اچھے

۲۔ شہ کی چوٹ شکم کی پوٹ۔

۳۔ بھیت، بسر جو کی جو کی لیت۔

ان جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ سید محمد مہدی کی تحریروں میں بھی دکنی اور ملفوظات کا اثر غالب ہے۔ قدیم دور میں سید محمد مہدی اور ان کے پیروں کی علمی زبان تو فارسی تھی لیکن ان کی ردِ مثرہ کی زبان دکنی تھی جس میں وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ مہدوی بزرگوں کے اقوال اور فقرے آج بھی تاریخ اور تذکروں میں محفوظ ہیں۔ تاریخ غویہ کے مصنف نے مہدوی کے ذریعہ اظہار بنانے کا یہی جواز دیا ہے کہ سبھی ہندی میں اپنے مفہوم اور مطلب کو بیان کرتے ہیں۔ تہا ان کا مطلب بھی اسی زبان میں بیان کیا جاتا ہے۔ مہدوی موعود نے بھی ہندی میں اپنے خیالات ارشاد فرمائے ہیں۔

قطب شاہی عہد میں اردو نثر ابتدائی مدارج میں تھی۔ شاعری کا ارتقاء

۱۔ ملفوظات حضرت سید محمد جوہنپوریؒ۔ مخطوطہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔

۲۔ تاریخ ادب اردو جلد اول از۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ صفحہ ۱۳۳ بحوالہ بحرالمنکات قلمی و بحوالہ مقالات شیرانی جلد دوم صفحہ ۲۸

عمل میں آ رہا تھا۔ چنانچہ اردو نثر کا فروغ گنتاں سارہ۔ چند نثر نگاروں نے علمی و ادبی نمونے پیش کرنے کی کوشش کی جن میں میراں جی حسین خدانا اور ان کی کتاب شرح تمہید ہمدانی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا شمار ایک رسالہ کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ مولانا عبداللہ نے اسی دکنی دور میں احکام الصلوٰۃ لکھی۔ وجہی کی سب رس، میراں یعقوب کی سسماں الاقصیٰ۔ عابد شاہ کی گلزار السائیکین اور کنز المومنین بھی قطب شاہی عہد کے نثری کارنامے سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح سلطان نے ایک کتاب دارالاسرار تحریر کی۔ یہ تمام کتابیں اگرچہ قطب شاہی نثر کی نمائندہ ہیں لیکن ان میں تذکرہ یا اس کی کسی شاخ کا دخل دکھائی نہیں دیتا۔ اسی لیے انہیں تذکرے یا ملفوظات میں شامل نہیں کیا جاتا۔ البتہ اس دور میں گجراتی علماء اور صوفیاء کی وہ فارسی کتابیں جن میں تحریر کے دوران دکنی فقرے استعمال ہوئے ہیں۔ انہیں تذکرے کی شکل ملفوظات میں شمار کیا جاتا ہے جن میں شاہ عالم عرف شاہ منجھن کی کتاب مراۃ احمدی، میر علی شہر قانع کی کتاب تحفۃ الکرام اس کے علاوہ جماعت شاہیہ، مراۃ سکندری، شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کی بحر الحقائق اور سید محمد چنبوری کے ملفوظات کو دکنی میں ابتدائی طور پر تذکرے کی روایت کو فروغ دینے والی تحریریں تصور کیا جاتا ہے۔ قطب شاہی دور میں یہ نثری کتابیں تذکرہ اور اس کی ابتدائی شکل ملفوظات کو فروغ دینے کا سبب ثابت ہوئیں۔ دکن میں قطب شاہی دور کے ساتھ ہی ایک اور سلطنت بیجاپور میں قائم تھی جسے عادل شاہی سلطنت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس سلطنت نے بھی دکنی کے فروغ میں حصہ لیا۔

عادل شاہی عہد:

دکن میں قائم شدہ پانچ سلطنتوں نے بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد ایک نئی زبان میں ادبی روایت کو فروغ دینے میں نمایاں طور پر حصہ لیا۔ ان پانچ سلطنتوں

میں دوسری بڑی سلطنت عادل شاہیہ تھی جو ۱۴۹۰ء سے ۱۶۸۵ء تک قائم رہی۔ اس دور میں دکنی کوفہ فروغ دینے کے لیے پوری کوششیں کی گئیں ساتھ ہی شعر و ادب سے دلچسپی کا رجحان بھی عام ہونے لگا۔ عادل شاہی دور اس وجہ سے بھی دکنی دور میں اہمیت رکھتا ہے کہ اس سلطنت سے وابستہ بادشاہوں نے شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی اور دکن میں ادبی دبستان کی بنیاد رکھی۔ ۱۶۹۰ء میں شروع ہونے والا عادل شاہی دور ابتدائی طور پر شعر و شاعری سے وابستہ رہا۔ پھر رفتہ رفتہ دکنی نثر کے نمونے عالم وجود میں آنے لگے۔ اس دور کی نثر دکنی طرز و انداز کی رہی۔ لیکن ادبی طور پر اس نثر میں کوئی خصوصیت واضح نہ ہو سکی۔ عادل شاہی دور کی نثر میں مذہبی عکس اس قدر نمایاں ہے کہ اسے ادبی تحریر کی خصوصیت نہیں دی جاسکتی اس دور میں دکنی ادب کی روایت پر جان چڑھتی رہی۔ لیکن ادبی طور پر تذکرہ یا اس قبیل کی کوئی فنی کتاب عالم وجود میں نہ آسکی۔ فارسی تحریروں کے درمیان دکنی نمونے پیش کرنے کا سلسلہ اس عہد میں منقطع ہو گیا۔ لیکن اردو کو درباری حیثیت حاصل ہو گئی اور دکنی زبان مکمل طور پر دفتری کاروبار کے لیے استعمال کرنے کا سب سے پہلا اقدام اسی سلطنت کے زیر اثر پڑا۔ چرٹھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

”جب ابراہیم عادل شاہ ثانی المعروف بہ جلالت گرد تخت نشین ہوا تو اس نے دفتروں میں اردو کو دوبارہ رائج کیا اور اس کے بعد عادل شاہی حکومت کے زوال تک اردو زبان ہی حکومت کے دفتروں کی زبان رہی۔ جلالت گرد کی کلیات نورس اور علی عادل شاہ ثانی کی کلیات اس بات کی گواہ ہیں کہ ان لوگوں کا فارسی زبان سے خاندانی رشتہ تقریباً منقطع ہو گیا تھا اور اردو زبان ہی ان کی زبان ہو گئی تھی“۔

اس دور میں دکنی الفاظ تخصیص کے ساتھ رواج پا گئے۔ لازمی ہے کہ جب سرکاری زبان ہی دکنی قدر دی جائے تو ملفوظات یا دیگر تذکرہ کی روایت فارسی کی بجائے اردو میں منتقل کر دی جائے۔ یہی عمل عادل شاہی دور میں دکنی کے ساتھ ہوا۔ اس دور میں تحریر یا بیان کے سرچشمے صرف شاعری سے منسلک رہے۔ بیجا پور کے انداز فکر کی نمائندگی کرتے ہوئے عادل شاہی سلطنت کی علم و ادب سے دوستی کو داکٹر جمیل جالبی اس طرح واضح کرتے ہیں:-

”بیجا پور کے تصوف نے اپنے ہندو پیٹن سے جو صورت بنائی وہ میراجی، جانم اور امین الدین اعلیٰ سے ہوتی ہوئی سارے معاشرے میں تصوف کی مقبول صورت بن گئی۔ اس پر بھی وہی مزاج غالب ہے جو بیجا پوری اسلوب کی انفرادیت ہے۔ عادل شاہی دور کی تخلیقی سرگرمیوں میں فن تعمیر خطاطی اور شعبہ ادب کو خاص اہمیت حاصل تھی ادب میں تاریخی اور مذہبی موضوعات بھی شامل تھے۔ لیکن سب سے زیادہ اہمیت شاعری کو حاصل تھی۔“ لہ

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عادل شاہی عہد میں نثر سے زیادہ شاعری کو ترقی ہوئی۔ تاریخ کی کتابوں میں تذکرہ کی روایت واضح نہیں ہوتی اور نثر میں تحریر کردہ اس دور کی تمام کتابیں تصوف اور اسلام سے متعلق ہیں۔ جن میں برہان الدین جانم کی کلمۃ المحقائق اور رسالہ وجودیہ کافی مشہور ہیں۔ ان مذہبی تحریروں میں تذکرہ یا ملفوظات کی روایات نہ ہونے کے برابر ہے۔ عادل شاہی دور میں تذکرہ کی کسی بھی

نظامت کو فروغ حاصل نہیں ہوا۔ اس دور کے ملفوظات بھی دستیاب نہیں ہوئے اس دور کے ملفوظات بھی دستیاب نہیں ہوئے البتہ شاعری عادل شاہی دور میں کافی عروج پر رہی۔ اگرچہ عادل شاہی دور سے پہلے اردو ملفوظات دستیاب ہوتے ہیں لیکن دور عادل شاہی کے ملفوظات اور تذکرے کا نایاب ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس دور میں بھی ملفوظات لکھے گئے ہوں گے جو زمانے کی خوردبرد کی نذر ہو گئے۔ اسی لیے ملفوظات کی شکل میں بھی ان کا ملنا دشوار ہے۔ بیجا پور کی درگاہوں کے متولوں اور سجادگان کے خصوصی ذخیرہ میں کئی قلمی نسخے موجود ہیں لیکن وہ انہیں بطور تیرک محفوظ رکھے ہیں یہاں تک کہ کسی کو اس کے مطالعہ کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ اگر یہ ذخیرے دستیاب ہو جائیں تو امکان ہے کہ مستقبل کے نقاد کے ہاتھ میں کچھ ایسی نایاب دستاویزیں آجائیں گی کہ جن کی وجہ سے دکن میں تذکرہ کے آغاز و عہد کو تعینت ملے گی۔

نظام شاہی دور :

دکن میں اردو یا دکنی کے فروغ کے لیے جن درباروں نے حصہ لیا ان میں نظام شاہی عہد بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ دکن میں پہلی سلطنت کے زوال کے بعد یہ تیسری سلطنت تھی جو دکن کے علاقہ احمد نگر پر قائم ہوئی۔ احمد نگر کی سلطنت نے ۱۶۹۵ء میں قیام کے بعد ۱۷۶۳ء تک حکومت کی اس دور میں اردو یا دکنی کی رفاہ اور اس کی ادبی تشکیل کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن تاریخی شواہد اور ادبی مخطوطے نایاب ہیں۔ کل دس بادشاہوں نے احمد نگر پر نظام شاہی سلطنت کا سگر چلایا۔ ان کا دور حکومت بھی کافی طویل رہا۔ اس دور کے نثری نمونے نایاب ہیں۔ البتہ شاعری کی چند کتابیں مخطوطات کی شکل میں دستیاب ہوئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ نظام شاہی دور میں بھی دکنی زبان اپنے ابتدائی مدارج طے کر رہی تھی۔

نظام شاہی عہد میں دکنی تذکروں کی تفصیل دستیاب نہیں تاہم چند ایسے شعرا ضرور ملتے ہیں کہ جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظام شاہی عہد میں بھی تذکرے لکھے گئے۔ رسالہ تذکرات میں نظام شاہی عہد کے تذکرے یاد کر کچھ اس انداز میں کیا گیا ہے۔

مجموعہ دواوین دکنی و ہندی:

یعنی تذکرہ نظام شاہی قدیم نظام الملک صومیہ دار دکن کے بزرگوں میں سے کسی نے تالیف کیا تھا۔ انھوں نے اپنے زمانے تک کے کل دیوان شعریٰ متقدمین ریختہ گوروں کا مجموعہ و ہندوستان میں گذرے تھے جمع کر کے ان کا کلام انتخاب کیا ان نواب صاحب نے ۱۱۶۱ھ میں انتقال کیا۔

یہ تذکرہ محققین کو ابھی تک دستیاب نہ ہو سکا۔ لیکن گارسان داسی نے اپنے خطبات میں اس کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ اس تذکرہ کے متن اذیضاً سے بھی واقفیت نہ ہو سکی لیکن اس بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ قطعاً شاہی دور میں لکھا گیا یہ تذکرہ دکنی اور ہندی شاعروں کی زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ انتخاب کلام کا ایک بہترین نمونہ تھا۔ اس تذکرہ کی تالیف کی خصوصیت جیسے کہ متن میں بیان کی گئی ہے۔ اس قدر ہے کہ صاحب دیوان شعرا کو ہی اس تذکرہ پر زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تذکرہ میں معیاری اساتذہ کا کلام منتخب کیا گیا ہو گا۔ نظام شاہی عہد کے تذکروں کی مایہ نافت نہ ہو سکی لیکن قدیم کتابوں میں بطور سند استعمال کیے جانے والے ناموں میں مزید کئی تذکروں کا ذکر گارسان داسی نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔

نظام شاہی عہد میں دکنی نثر پر والان چڑھ چکی تھی اور وہ تذکرہ کی

شکل میں صنفِ ادب کا حق ادا کر رہی تھی۔ زمانے کی خود بردہ نظام شاہی اردو اسی عہد کے تذکروں کو نیست و نابود کر دیا۔ لیکن اس کے آثار قدیم کتابوں میں موجود ہیں۔ دکنی کے محققین سے توقع ہے کہ وہ ایسے تذکروں کی بازیافت کے لیے تحقیقی کوششیں جاری رکھیں گے۔

برید شاہی دور:

۱۷۸۴ء میں بھی سلطنت کا سیرازہ بکھرنے کے بعد بیدر میں قائم ہونے والی برید شاہی سلطنت کے زیر اثر بھی دکنی زبان و ادب کا ارتقا ہوا۔ اس دور کے ادبیات کا سراغ نہ مل سکا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بھی سلطنت کے بعد دکن میں قائم ہونے والی تمام سلطنتوں نے ایک نومولود زبان کی ترقی میں حصہ لیا۔ بیدر کو علم و ادب کا گہوارہ بنانے میں برید شاہی سلطنت کا خاص حصہ رہا ہے۔ امیر قاسم نے اس سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ وہ دور تھا جبکہ دکن میں ایک نئی زبان کا شہرہ ہو گیا تھا۔ ادیب و شاعر اس نئی زبان کو تخلیق کا ذریعہ بنانے میں خود کی عزت افزائی سمجھتے تھے کیونکہ دکنی زبان میں ابتدائی طور پر شاعری کا چرچا رہا اسی لیے دکن کے قدیم دور میں نثر پاروں کی چھان بین کافی کمٹھن مسلک ہے۔ اگرچہ چودھویں صدی سے دکن میں تخلیق کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا لیکن نثری ادب کی نشو و نما کی رفتار کافی سست رہی۔ قدیم مخطوطات میں شاعری غونے تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن نثری کارناموں کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی رہی کہ دکن کے کارناموں کو محفوظ کرنے کا شعور انیسویں صدی کے بعد پیدا ہوا جبکہ دکنی ادب کا بیشتر ذخیرہ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ برید شاہی دور کے کارنامے بھی اسی تباہی کی نذر ہو گئے۔ دکن میں سب سے پہلے دکنی زبان و ادب کی ترویج کی شہنشاہی سلطنت کے بادشاہوں نے جلائی اور اس سلطنت کے اختتام کے بعد دکن میں قائم بقیہ سلطنتوں نے

اس شمع کو روشنی رکھنے میں کوئی دقیقہ اٹھاتا نہ رکھا۔ جن میں برید شاہی کا شمار بھی ہوتا ہے۔ بیدار اور اس کے اطراف و اکناف کے کتبوں کے مطالعہ اور اس دور کی فارسی کتابوں کی چھان بین سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سلطنت کے زیر اثر فارسی کے درمیان دکنی جملوں کے استعمال کو روارکھا گیا تھا۔ نظام شاہی دور کی طرح برید شاہی دور کے کارناموں پر بھی تک روشنی نہ پڑ سکی شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ قدیم مورخین نے ان دو سلطنتوں کی ادبی خدمات کی جانب توجہ نہیں دی۔ اس عہد میں کئی تاریخی مذہبی اور عقائد سے متعلق کتابیں لکھی گئیں جن میں بیشتر کا تعلق فارسی زبان سے ہے۔ نصیر الدین عیسیٰ نے اپنی کتاب "دکن میں اوردو" کے ذریعہ اس دور کے صرف ایک دکنی شاعر قریشی ستونیؒ کا ذکر کیا ہے۔ اس عہد کے دکنی نثر نگاروں کا کوئی ٹھوس ثبوت اور تخلیق کا کوئی حوالہ نہ مل سکا۔ دور قدیم میں کتابیں محفوظ رکھنے کا کوئی جامع طریقہ کار نہ ہونے کی وجہ سے بیشتر ذخیرہ تلف یا ضائع ہو گیا جن میں برید شاہی دور کے کارنامے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

عالمگیری دور :

دکن میں مغلوں کی آمد نے نہ صرف یہاں کی سلطنتوں کو نہیں نہیں کر دیا بلکہ مغلوں کے حملوں کا اثر دکنی پر کافی گہرا پڑا۔ اگرچہ جہانگیر کے دور ہی سے بلکہ اکبر کے زمانے میں مغلوں نے دکن کی جانب نگاہ کی لیکن دکن کے علاقہ پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر ہے۔ ایام شہزادگی کے دوران ہی وہ دکن میں تھیں تھا۔ چنانچہ سب سے پہلی بار وہ ۱۶۳۶ء میں زالیہ خاں سے دکن بن کر آیا جبکہ اس نے ۱۶۵۸ء میں شہنشاہیت سنبھالی اس طرح ۲۲ سالہ میں اس کا انتقال ہوا چونکہ اورنگ زیب کے عہد یعنی ۱۶۵۸ء تا ۱۶۸۱ء تک دکن کی جانب اس کی نظر مرکوز رہی۔ اسی لیے اس

عہد کو عالمگیری دور کہا جاسکتا ہے۔ اس کے دور میں نہ صرف دکن علم و ادب کا گہوارا بن گیا بلکہ دور و راز کے ملکوں سے عالم اور فاضل اشخاص دکن میں جمع ہونے لگے۔ اس دور میں اورنگ آباد علاقہ دکن کا مرکز قرار پایا جہاں شاعروں اور ادیبوں کی کثیر تعداد جمع ہو گئی اور یہی وہ دور ہے جہاں سے دکنی زبانوں میں "کامل تذکرے" لکھنے کی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی عہد میں اردو کے ابتدائی تذکرے لکھے گئے۔ فارسی میں لا تعداد تذکرے موجود ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے یہاں پر دکنی تذکروں سے بحث کی جائے گی۔

شہنشاہ عالمگیر کے دور میں فارسی کا رواج تھا۔ دکنی کی سلطنتوں پر قبضہ کی وجہ سے وہ حکومتیں جو دکنی کی ترقی کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھیں تباہ ہو گئیں۔ اس طرح دکنی ادب کی سرپرستی ختم ہو گئی۔ دکن کے بیشتر شاعر اور ادیب اورنگ آباد میں جمع ہو گئے۔ مغلیہ تسلط سے دکنی کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس دور میں مقیمی، عاجز، ضعیفی، فدائی، بھری، عشق، ہنر، دلی، وجدی، آزاد، صنعتی، مولیٰ بیجا پوری جیسے شاعر گزرے ہیں جبکہ اورنگ آباد میں دکنی اورنگ آبادی داؤد اورنگ آبادی۔ سراج اورنگ آبادی اور دیگر شعرا گزرے ہیں۔ اس دور میں بھی شاعری کا شور مچا۔ چند نثر نگاروں نے کچھ کارنامے انجام دیئے بھی تو اس قدر کہ مذہبی کتابوں کی تشریحات کو رد رکھا۔ اس عہد میں دکنی عام بول چال کی زبان بن چکی تھی۔ البتہ اس دور کے نثری کارناموں کی بازیافت نہ ہو سکی۔

عالمگیری دور کو اس اعتبار سے اہمیت دی جاسکتی ہے کہ اس عہد میں دکنی علاقوں میں مکمل تذکرہ "لکھنے کے لیے سازگار ماحول پیدا ہوا اور دکنی نثر کا ایک مزاج بننے لگا۔ دکن کے نثر نگاروں نے فارسی تذکرہ لکھنے کی بنیاد رکھی جس کی وجہ سے دکنی میں تذکرے لکھنے کی ترغیب مل سکی۔ اس عہد کو دکنی تذکروں کا فنی مزاج بنانے کا عہد کہا جاسکتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیری کی وجہ سے دکن اور دہلی کا ارتباط ہوا۔ دکنی اور دہلی

کی زبان کے الفاظ ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ دکنی مزاج دہلی کی آمیزش کا آغاز ہوا۔ یہی دور ہے جب کہ دکنی نے اپنا چولا بدلا اور اس نے دکنی کے مرہٹی، کنٹری ٹیگو اور گجراتی الفاظ کی تماشش و خراش کر کے انہیں ادبی بنانے پر زور دیا۔ اس طرح ایک بات پجری زبان دکنی کو نیا آہنگ ملنے لگا۔ اسی عہد کی اثر اندازی کی وجہ سے بعد میں دکنی میں جتنے تذکرے لکھے گئے وہ تمام نئے لب و لہجے کے علمبردار ہو گئے۔ اگر دکن پر عالمگیری دور نہ آتا تو اس کے تمام ادبیات میں دکنی اثر غالب رہتا۔ اور نگ زیب عالمگیری کی وجہ سے دکن اور دہلی کی بولیوں کا اختلاط ہوا اور دونوں بولیوں کے سنگم سے ایک نئی زبان سے ایک نئی زبان سے سراٹھایا جس میں دہلی کے الفاظ بھی شامل تھے اور دکنی کا لب و لہجہ بھی لیکن دکنی لب و لہجہ کسی قدر صاف ہونے لگا تھا کیونکہ دہلی الفاظ کی نفاست نے دکنی الفاظ کے کھردرے پن کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ اسی عہد میں زبان دکنی کا خاتمہ ہوتا ہے اور دکن کے تمام نظم و نثر پر دہلی کا اثر غالب ہو جاتا ہے اس طرح دکنی لب و لہجہ اس دور میں آکر دم توڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد جتنی بھی کتابیں دکن میں لکھی گئیں ان میں دہلوی الفاظ اور انداز کا پر تو شامل ہونے لگا۔ اس طرح دہلوی لہجہ فاتح ہو گیا اور دکنی لہجہ مفتوح قرار دیا جا کر قعر گمنامی میں چلا گیا۔

عالمگیری عہد سے دکنی روایات ہمار ہو گئیں۔ دکنی ادب ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ دکنی پرفارمی آمیزی کا لبادہ اثر انداز ہونے لگا۔ دکنی شاعروں اور ادیبوں دہلویت کو قبول کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں دکنی طرز و انداز رفتہ رفتہ مٹنے لگے اس طرح مسئلہ عہد تک تمام دکنی ادبیات پر دہلویت کا رنگ چڑھ گیا۔ اور دکنی ادیبوں نے ایسی دکنی کو اپنا انداز تحریر بنالیا جو دکنی سے دور اور دہلی کے لب و لہجہ سے قریب ہو گئی۔ دکنی تذکروں میں عالمگیری عہد کو اس وجہ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس کی وجہ سے دکنی زبان میں تغیر پیدا ہوا اور اب دکن مکمل طور پر دہلی کا پر تو نظر

لگا۔ عالمگیر کے عہد میں دکنی نثر کے کارنامے واضح نہ ہو سکے۔ اس عہد میں بھی شاعری کو عروج حاصل ہوا۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس عہد کی وجہ سے اورنگ آباد کو دکن کے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی اور سارا دکنی ادب سمٹ کر اس علاقے کی حد تک محدود ہونے لگا۔ اس طرح اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں دکنی نے اپنی روایت کو خیر باد کہا اور دہلی کے نئے قالب کو اپنے جسم سے جگہ دی۔ اس دور کے نثری کارنامے قصبہ گمنامی کے نذر ہو گئے۔

آصف جاہی دور :

دہلی میں مغلیہ سلطنت کمزور پڑ جانے کے بعد دکن کے بہت سے علاقے خود مختار ہو گئے جن میں آصف جاہی سلطنت کافی اہمیت کی حامل ہے۔ میر تقی الدین علی خاں آصف جاہ اول نے اس سلطنت کی ۱۷۲۴ء میں بنیاد رکھی اور اسی سلطنت نے اردو کی ترقی کا بیڑا اٹھایا۔ ہندوستان میں یہی وہ پہلی سلطنت ہے جس نے اردو زبان کو دور جدید میں کافی حد تک پروان چڑھایا۔ یہ سلطنت ہندوستان کی آزادی تک قائم رہی اور اس کے زیر اثر ادیبوں اور شعراء کی ہمت افزائی ہوتی رہی۔ اس دور میں لاتعداد تذکرے لکھے گئے۔ جن میں دکنی اور دہلوی شاعروں کے حالات اور کلام کو جگہ دی گئی تھی۔ چونکہ آصف جاہی دور کے تذکروں کی فہرست کافی طویل ہے اور تقریباً تمام تذکرے شائع ہو چکے ہیں اور جو خطوطات کی شکل میں ہیں ان کا جائزہ دو ابواب "دکنی تذکروں کی انتیازی خصوصیات" اور "غیر مطبوعہ دکنی تذکروں کا تحقیقی جائزہ" میں لیا جا چکا ہے۔ اور بقیہ تذکروں کی فہرست مقالہ کے آخر میں شامل کر دی گئی ہے۔ اسی لیے اس عنوان کے تحت آصف جاہی دور کے ابتدائی عہد میں دکن میں جو تذکرے لکھے گئے ان کا تحقیقی اور تنقیدی معائنہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ آصفی دور کے ابتدائی

تذکروں کا علم ہو سکے۔ اگرچہ یہ تذکرے بھی شائع ہو چکے ہیں لیکن ان پر تحقیقی نظر قدامت کی وجہ سے ضروری ہو جاتی ہے۔

گلشن گفتار:

دکن کے عموماً، اردو کے خصوصاً اولین تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے جسے خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی نے ترتیب دیا۔ اس تذکرہ کے متعدد قلمی نسخے مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ پروفیسر سید محمد نے ترتیب دہواشی کے ساتھ اکٹھا کیا گیا ہے اس تذکرہ کی سن تالیف ۱۵۵۲ھ سے قبل خیال کی جاتی ہے جس کی بنیاد پر یہ اردو کا پہلا تذکرہ قرار پایا ہے۔ تقریباً اسی عہد میں میر تقی میر نے تذکرہ "نکات الشعراء" لکھا تھا۔ گو کہ "نکات الشعراء" کو بھی اولیت حاصل ہے۔ لیکن گلشن گفتار کا مرتبہ اس دیر سے بلند ہو جاتا ہے کہ اس تذکرہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا کہ اس نے آغاخان سے اختتام کے تمام مراحل تھوڑی سی مدت میں طے کر لیے جبکہ میر نے اپنے تذکرہ کی تحریر کے لیے عرصہ وقت صرف کیا۔

خواجہ خاں حمید تذکرہ لکھتے وقت میر کے نکات الشعراء سے ناواقف تھے۔ اس نے زیادہ تر شعراء کا تعارف نہایت مختصر انداز میں کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ تذکرہ تو دکنی کے شعراء کے بارے میں لکھا گیا ہے لیکن اسلوب فارسی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ نقوی نے اس تذکرہ کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ حمید کی طرز تذکرہ نگاری سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے صرف اپنے تاثرات اور معلومات کو مجمل و مختصر جملوں میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے گلشن گفتار پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”اتھائی سطوح میں پیش کیے گئے دیباچہ کے اقتباس سے ظاہر ہے

"گلشنِ گفتار" کی ترتیب کسی سنجیدہ محرک کے بجائے تفریح طبع اور وقت گزاری کے خیال سے عمل میں آئی تھی" لہ

ڈاکٹر حنیف نقوی کے اس بیان پر تبصرہ سے قبل یہ دیکھنا پڑے گا کہ دورِ قدیم کے کونسے تذکرہ نگار نے سنجیدہ محرک کے تحت تذکرہ نگاری کی۔ خود میر نے نکات الشعراء لکھنے کے لیے ذاتی بعض کو بروئے کار لایا جس کا ذکر محمد حسین آزاد نے "آب حیات میں کیا ہے۔

"نکات الشعراء" شاعر کے لیے بہت مفید ہے۔ اس میں شعرائے اردو کی بہت سی باتیں اس زمانہ کے لوگوں کے دیکھنے کے قابل ہیں مگر وہ بھی اپنا انداز قائم ہے۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھوں گا مگر ان کو نہ لوں گا جی کے کلام سے دماغ پریشان ہو۔ ان ہزار میں ایک بے چارہ بھی ملے اور ملا متوں سے نہیں بچا۔" لہ

اس بیان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ میر کا نکات الشعراء لکھنے کا مقصد بھی تفریح طبع اور وقت گزاری تھا۔ اگر کوئی سنجیدہ محرک کا فرما ہوتا تو وہ اپنے تذکرے میں اس دور کے تمام شعراء کو شامل کرتے کسی قسم کی تخصیص روا نہ رکھتے اس طرح ڈاکٹر حنیف نقوی کا اعتراض غلط ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ قدیم دور میں نثر تفریح کی غرض سے ہی رواج پاتی رہی۔ اس کی بہترین مثال اردو کی نثری داستانیں جس کے ذریعہ نثر نگار فن پر توجہ سے زیادہ تفریح کے ذرائع فراہم کرنے پر زور دیتے

تھے۔ غرض خواجہ خاں حسید کا تذکرہ گلشنی گفتار اس وجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے ذریعہ دوسرے قدیم کے شاعروں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ایک ابتدائی نمونہ میں فنی کی تلاش ایک مشکل امر ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی گلشن گفتار کے مرثیہ کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”بہن دکنی شاعروں کا ذکر دوسرے تذکروں میں قطعاً مفقود ہے۔ ان کے متعلق اس تذکرے کے بیانات سے اہل تحقیق کو بڑی مدد مل سکتی ہے۔“
انھوں نے پروفیسر سید محمد کی تائید کرتے ہوئے اس تذکرہ کی حیثیت کو سمرا لیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ گلشن گفتار دکنی اور اردو کے تذکروں میں اپنی افسردہ خصوصیت کا نمائندہ ہے۔

چمنستان شعراء :

دکن کے ہم عصر تذکروں میں اس تذکرہ کا شمار کیا جاتا ہے جسے لالچھی نارائن شفیق نے تحریر کیا۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۶۱-۱۲۶۲ھ ہے جسے مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے ۱۹۲۸ء میں شائع کر دیا۔ اس تذکرہ میں شفیق نے قاعدہ جمل کے بموجب حروف ابجد کے اعتبار سے ۲۱۳ شاعروں کے حالات اور کلام کو پیش کیا ہے۔ اس تذکرہ کی خصوصیت بھی یہی ہے کہ اس میں دکنی اور اردو کے شاعروں کے حالات جمع کیے گئے ہیں لیکن اس کا اسلوب فارسی ہے۔ لالچھی نارائن ایک اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ انھیں غلام علی آزاد بلگرامی کی صحبت حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ ان کا تذکرہ اردو کے جامع ترین تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

پچھی نارائن شفیق کی تذکرہ نگاری کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر حنیف نقوی نے لکھا ہے:

”تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اتنے کم وقت کے اندر اتمام کار کی مثالیں نادر و نایاب تو نہیں لیکن کم یا ب ضرور ہیں۔“ ۱

شفیق نے بہت کم عرصہ میں تذکرہ ترتیب دیا اس کے باوجود ان کے تذکرہ میں تاریخ گوئی کا شغف واضح ہے جس کے ساتھ ساتھ شاعروں کے حالات اور انتخاب کلام کے موقع پر وہ سخن فہمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شعراء کے حالات زندگی کے بارے میں بقول ڈاکٹر حنیف نقوی ”شفیق نے بالعموم انھیں باتوں کا اعادہ کیا ہے جو ان سے قبل دوسرے تذکرہ نگار لکھتے آئے ہیں“ لیکن دیگر تذکرہ نگاروں کے مقابلہ میں شفیق کی انفرادیت یہی ہے کہ انھوں نے بعض شاعروں کے زمانہ ہائے وفات کا تعین کیا جو ان سے قبل کے کسی تذکرہ نگار نے انجام نہیں دیا تھا۔ ان کی اس جدوجہد کو سراہتے ہوئے لکھا ہے۔

”سوانح حیات کے ذیل میں سنین کی نشاندہی ایک بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن شعراء اردو کے ابتدائی شعراء کے تذکروں کی یہ ایک بڑی خامی ہے کہ ان کے مولفین اس ضرورت کے احساس سے یکسر نا آشنا رہے ہیں۔ شفیق پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس روش خام کے خلاف واضح الفاظ میں بعض شاعروں کے زمانہ ہائے وفات کا تعین کیا ہے۔ اس امر میں تاریخ گوئی سے ان کی دل چسپی ایک اہم محرک کی حیثیت سے کارفرما رہی ہے۔ چنانچہ انھوں

کبھی کبھی مفرد تاریخی مصرعے اور کبھی مکمل قطعات بھی بطور سند پیش کیے ہیں۔" لہ

چھستان شعراء میں کبھی نامائن شفیق نے خاکہ کشی، سیرت و شخصیت کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ شاعروں کا طرز تعارف انوکھے انداز کا ہے اسی لیے ڈاکٹر حنیف نقوی نے کبھی نامائن شفیق کے اس تذکرہ کو سیرت و کردار و اخلاق و عادات کی پیش کشی کا نمونہ اور ادبی و فنی اکتساب کی تحسین و توصیف کی یادگار قرار دیا ہے۔ انھوں نے تذکرے کے دوران ان شاعروں کی طبیعت اور مزاج کے مختلف گوشوں کو بھی تبصرہ میں لایا ہے۔ بقول ڈاکٹر حنیف نقوی چھستان شعراء میں ابتدائی دور کی عام رطایات کے بخلاف تنقیدی مواد بھی خاصی مقدار میں موجود ہے۔ "غرض اس تذکرہ کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شفیق ذاتی طور پر خود و فکر کے ذریعہ مسائل کی تہہ تک پہنچنے کے عادی ہیں۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے اس تذکرہ میں فنی کا ارتقا سا نظر آتا ہے۔

کبھی نامائن شفیق کا تذکرہ اردو ادب کا پہلا تذکرہ ہے جس میں فن کا نکھار شخصیت و سیرت نگاری کا پرتو، تعارف و تبصرہ کی جھلک، سوانحی انداز اور فنی و ادبی شعور کا نمایاں اظہار دکھائی دیتا ہے۔ شفیق کی تاریخ نگاری بھی اس تذکرہ میں واضح ہوتی ہے۔ غرض یہ تذکرہ فن کے تمام لوازمات کی تکمیل کرتا ہے۔ اسی لیے اس کی ادبی حیثیت دو چند ہو جاتی ہے البتہ انتخاب کلام اور اندراجات کے موقع پر بعض شعراء غلطی سے اصل شاعر کی بجائے دوسرے شاعروں کے سرمایہ افکار میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس غلطی کو اس وجہ سے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ دور قدیم میں کلام کا

انتخاب بھی ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ اس کے علاوہ شفیق سے اس قسم کی غلطی صرف دو ہی کے شاعروں کے انتخاب کلام کے موقع پر ہوئی ہے۔ چونکہ شعرائے دہلی کا کلام حاصل کرنا اہل دکن کے لیے دشوار تھا اسی لیے شفیق کی یہ غلطی قابل برداشت ہے شاید اس لیے حنیف نقوی نے کہا ہے کہ "ان معدودے چند خامیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ حیثیت مجموعی یہ تذکرہ کافی اہم اور قابل قدر ہے اور قدیم ادب سے معنی تحقیق و تنقید کے مرحلے میں ایک ناگزیر ذریعہ معلومات کی حیثیت رکھتا ہے"۔ ۱۷

شفیق کا یہ تذکرہ دکنی ادب کی معراج تصور کیا جاتا ہے بلکہ یہ کہتا ہے جہانہ ہو گا کہ اسی تذکرہ کے توسط سے اردو میں فن تذکرہ کی روایت پر دان چڑھی کیونکہ شفیق ہی وہ پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے تذکرہ کے فنی اصولوں کو سلوک میں لایا۔ دکنی تذکروں میں چمنستان شعراء کو بنیاد کا درجہ حاصل ہے اگرچہ اس سے قبل شمالی ہند میں نکات الشعراء جیسا تذکرہ موجود تھا۔ لیکن اس میں فن کا نکھار نہ تھا۔ شفیق سے پہلے فن کو استعمال کرتے ہوئے یہ تذکرہ لکھا۔ شمالی ہند میں جتنے بھی تذکرے لکھے گئے وہ چمنستان شعراء کے بعد کے عہد سے متعلقہ ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۶۲-۱۶۹ء ع میں ترتیب دیا گیا جبکہ گلشن لاز، مخزن نکات اور طبقات الشعراء بالترتیب ۱۷۹۹ء ۱۷۹۳ء اور ۱۸۰۹ء کے مرتبہ ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شفیق کا چمنستان شعراء ہی وہ واحد تذکرہ ہے جس میں پہلی بار تذکرہ کے فنی لوازمات کو بروئے کار لایا گیا۔ اس طرح یہ تذکرہ ادبی، فنی اور تاریخی اعتبار سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعہ اردو ادب، تذکرہ کے فن اور شعراء اردو کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے

بہار و خزاں :

دکن میں تحریر کردہ ہم عصر تذکروں کا تعلق اورنگ زیب کی سر زمین سے ہے
 تذکرہ "بہار و خزاں" کے مؤلف بہاء الدین حسین خاں عروج بھی اورنگ آباد کے رہنے
 والے تھے۔ چند سال پہلے تک اس کا ایک ناقص اور بوسیدہ و کوم خوردہ نسخہ کتب خانہ
 آصفیہ حیدر آباد میں محفوظ تھا لیکن اب اس کا سراغ نہیں ملتا۔ بقول ڈاکٹر حنیف نقوی
 "یوسف سرمست کی مرتب کی ہوئی فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ مؤلف نے اس تذکرہ
 میں کم از کم ۸۱ شاعروں کے حالات اور اشعار درج کیے تھے۔" اس تذکرہ کی
 سنہ تالیف کا پتہ نہ چل سکا۔ لیکن یہ حقیقت واضح ہے کہ اس کی تالیف تمنا اورنگ آبادی
 کے تذکرہ "محل حجاب" سے قبل ہوئی۔ چونکہ یہ تذکرہ اب عدم دستیاب ہے اس لیے
 اس کے مواد اور فن کے بارے میں کوئی بحث ناممکن ہے۔ البتہ آتنا ضرور کہ جاسکتا ہے
 کہ اس عہد میں اورنگ آباد کو مرکزیت حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ ہم عصر تذکرے لکھنے والوں
 میں تمام کا تعلق اورنگ آباد ہی سے ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی کہ غلام علی آزاد
 بلگرامی کی فیض صحبت سے یہاں ایک ادبی ماحول پیدا ہو گیا تھا۔

جس کا نتیجہ یہ رہا کہ ہر قسم کی ادبی سرگرمیاں دکن کے اس
 قدیم شہر اورنگ آباد سے وابستہ ہو گئیں۔ یہاں تک کہ دکنی کے ایتھرائی چارلہم تذکرہ
 بھی اسی سرزمین پر لکھے گئے۔ اس تذکرہ اور اس کے مؤلف کے بارے میں معلومات حاصل
 نہ ہو سکیں۔ لیکن ڈاکٹر یوسف سرمست کے حوالے کی وجہ سے اسے دکنی تذکروں میں شمار
 لیا جا رہا ہے۔

گلِ عجائب:

دکن کے باشندہ اسد علی خاں تمنا اور نگ آبادی کا لکھا ہوا یہ تذکرہ ۱۹۳۶ء میں مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اردو ہند سے شائع ہوا۔ اس تذکرہ کا واحد نقلی نسخہ آصفیہ لائبریری میں محفوظ ہے جسے اب ریاستی آرکائیوز کے حوالے کیا گیا ہے۔ اس تذکرہ کی سند تالیف کے بارے میں مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمے میں آؤ ڈاکٹر حنیف نقوی نے "شعراۓ اردو کے تذکرے" میں طویل بحث کی ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس تذکرہ کی سند تالیف ۱۷۸۶ء بتایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس میں ۱۷۸۶ء تک اضافہ ہوتے رہے۔ ڈاکٹر نقوی کے مطابق تمنا نے اس تذکرے کی ترتیب کا کام ۱۷۸۸ء میں شروع کیا تھا۔ یہ جس کے اختتام کے بعد بھی کئی اضافے کیے گئے۔ تمنا نے یہ تذکرہ اپنے دوست محمد کرم بخش سالم کی فرمائش پر ترتیب دیا۔ شاید خوب سے خوبتر کی تلاش میں انھوں نے بار بار اضافوں کو درکار کیا ہو۔

اسد علی خاں تمنا نے اس تذکرہ میں جن شاعروں کو شامل کیا ہے وہ ان کے ہم عصر اور ہم وطن تھے۔ یعنی انھوں نے اپنی زندگی میں ایسے شعراء کا تذکرہ لکھا جو یا تو ادنگ آباد اور اس کے متعلقہ علاقوں کے تھے یا کسب معاش کے سلسلہ میں دکن آئے تھے۔ اس تذکرہ میں بیشتر شعراء دکن سے متعلق ہیں۔ تمنا نے اس قرب زمانی و مکانی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے جس کے ساتھ ہی وہ شعراء کی دلالت اور وفات کی تواریخ اور سنین لکھنے کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ دکن کے دیگر تذکروں کی طرح یہ تذکرہ بھی دکن کے شعراء کا تعارف فارسی زبان میں کرواتا ہے۔

تمنا کے تذکرہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شعراء کے حالات اور واقعات کو بیان کرنے کے لیے ایسا اسلوب بردار رکھا جس میں مورخہ شاعروں کی پختگی پر مدنی طرح نمایاں ہے۔ اندازِ تعارف کی حد تک انھوں نے دکنی شعراء کی سوانح پر خاص توجہ دی ہے جبکہ شمالی ہند کے شعراء کے تعارف کے مرقع پر ان کی بے دلی صاف طور پر نکلتی ہے۔ ویسے بھی اس تذکرہ میں شمالی ہند کے شعراء کی تعداد محض برائے نام کی حد تک ہے اس کی سب سے بڑی وجہ حصول معلومات کی دشواری محسوس ہوتی ہیں۔ پھر بھی تمنا نے ممکنہ حد تک ہر شاعر کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کی سعی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تذکرہ میں شعراء کی ولادت اور وفات کی سینی درج ہیں۔ تمنا کے اس تذکرہ کے بارے میں ڈاکٹر حنیف نقوی رقم طراز ہیں۔

”سیرت اور شخصیت اور کلام کے بارے میں تنقیدی مواد کی کمی کے باوجود ”گل عجائب“ کی تاریخی اور سوانحی پہلو کی اہمیت اسے ممتاز تذکروں کی فہرست میں شامل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس تذکرہ سے دکنی شاعروں کے حالات زندگی کے بہت سے گوشے ہمارے سامنے آئے ہیں اور ایسے واقعات اور حقائق تک ہماری رسائی ہوئی ہے جن سے تاریخ ادب کی ترتیب میں کافی مدد مل سکتی ہے۔“

تمنا کے تذکرہ میں فن تذکرہ کی جھلکیاں نمایاں ہیں لیکن سوانح کے علاوہ دیگر پہلوؤں کے لحاظ سے انہوں نے اس تذکرہ میں قریبی لوگوں سے واقفیت کی بنا پر ان کے حالات تفصیلی طور پر درج کیے جبکہ دور دراز کے شاعروں کے حالات کو سطحی انداز میں بیان کیا۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو ان کے تذکرہ کو کسی قدر غیر معیاری کر دیتا

لیکن اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ تمنا نے سوانح تحریر کرنے کے لیے مقدور ہونے کو کوشش کی کہ ہر شاعر کے مکمل حالات اس میں درج کیے جائیں مثلاً اسی لیے انھوں نے تذکرہ میں کئی بار اضافے کیے۔ جیسے جیسے کسی شاعر کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی گئیں ویسے ہی اس کے بیان میں اضافہ کر دیا۔ یہی عمل تمنا کے ذہن کو تحقیقی انداز رکھنے والا بنا دیتا ہے کیونکہ انھوں نے اپنی تحریر کو حرف آخر کا درجہ نہیں دیا بلکہ اضافوں کے ذریعہ تذکرہ کو جامع ترین سوانح کا مجموعہ بنانے کی کوشش کی۔ ان کا یہ عمل نہیں شعوری تذکرہ نگار کا درجہ دیتا ہے غالباً تمنا ہی اردو کے پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے ابتدائی مواد پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جیسے جیسے مواد حاصل ہوتا گیا اسے تذکرہ کو فریٹ بخشی۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے تمنا کا تذکرہ اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ ہم عصر تذکروں میں کسی نے بار بار تصحیح اور اضافے کے عمل کو اختیار نہیں کیا جبکہ ایک تحقیقی عمل میں بار بار مواد کی دستیابی کے ساتھ ساتھ اضافے بھی کیے جاتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے اس عمل کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ اسے عملی طور پر بھی پیش کیا ہے اسی لیے اردو تذکرہ نگاروں کی فہرست میں اسے خاص درجہ حاصل ہے۔

تحفۃ الشعراء :

دکن میں تحریر کردہ تذکروں میں تحفۃ الشعراء ایک ایسا تذکرہ ہے جس میں ۶۲ شاعروں کا ذکر موجود ہے۔ افضل بیگ قاشال اور رنگ آبادی نے اسے ۱۰۵۲ھ میں مرتب کیا۔ مخطوط کے ذریعہ سن ترتیب کا سال واضح نہیں کیا گیا بلکہ عارف خالد بن عاجز اور آزاد بالنگامی کے قطععات تاریخ کے توسط سے ۱۰۵۵ھ کا خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا شمار اردو کے ابتدائی تذکروں میں کیا جاتا ہے۔ قاشال نے بیشتر فارسی گو شعراء کا تعارف کروایا ہے جبکہ صرف ۱۰ اردو شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے

ڈاکٹر حنیف نقوی لکھتے ہیں۔

”مولوی عبدالحق اور ان کے ہمنوا بھی اسے شعرائے اردو کے تذکروں میں شمار کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اصولاً یہ فیصلہ درست نہیں کیونکہ تحفۃ الشعراء کی اصلی حیثیت فارسی تذکرے کی ہے اور اسے اسی نظر سے دیکھنا ہوگا۔“

تحفۃ الشعراء کے بارے میں ڈاکٹر حنیف نقوی کا یہ استدلال اس تذکرے کے مواد کی غمازی کرتا ہے۔ ان کا یہ کہنا قطعی اصولی ہے کہ چونکہ اس تذکرہ کا بیشتر مواد فارسی شعرائے متعلق ہے اسی لیے اسے فارسی تذکروں میں جگہ دی جانی چاہیے۔ اس استدلال کے دوران ڈاکٹر حنیف نقوی اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ جس دور میں یہ تذکرہ لکھا گیا اس وقت اردو کے شاعر کسی علمدہ زبان سے متعلق افراد نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ فارسی گو شعراء ہی اردو یا دکنی میں شاعری کیا کرتے تھے اسی لیے یہ امکان ہے کہ قاتشال نے جن فارسی شعرا کو اپنے تذکرہ میں شامل کیا ہے ان کا اردو کلام بھی رہا ہو جو زمانہ کی دست و برد کے نتیجہ میں ہمیں دستیاب نہ ہو سکا ہو۔ اس کے علاوہ ایک ایسے دور میں جبکہ اردو کا کوئی تذکرہ نہ ہو فارسی شعراء کی سوانح لکھتے ہوئے اردو شاعروں کے حالات بھی تذکرہ میں شامل کر دینا بڑی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے کیونکہ آج کے دور میں دو لسانی اور سہ لسانی کا رنگہاریوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ فضل بیگ قاتشال نے اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ تذکرہ لکھا ہو۔ اس اعتبار سے تحفۃ الشعراء کو خاصا مقام ملنا چاہیے کیونکہ قدیم دور میں اس تذکرہ نے دو لسانی خصوصیات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ قاتشال کا یہ تذکرہ عہد قدیم میں دو لسانی خصوصیات کا حامل ہونے کی وجہ سے کافی اہمیت

رکھتا ہے۔ تحفۃ الشعراء کو انفسر ادیت حاصل ہے کہ اس تذکرہ کے ذریعہ قدیم دور میں
دو زبانوں کے شعراء کے حالات کو یکجا کرنے کی پہلی بار کوشش کی گئی جو کامیاب
رہی اور یہ عمل دور جدید کا خاصہ ہے۔ ایک ایسے دور میں جبکہ اردو کے سب سے پہلے
تذکرے عالم وجود میں آئے۔ قاتل کی یہ جدت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اسی عہد میں
میر تقی میر نے "لغات الشعراء" لکھا اور اردو کے دیگر دو تذکرے ظہور میں آئے۔ ایک ایسے
دور میں جبکہ اردو کے ابتدائی تذکرے لکھے گئے اور تذکرہ کافن Take off کے عہد
میں داخل ہوا۔ قاتل کی یہ کوشش سراہنے کے قابل ہے۔

تحفۃ الشعراء میں مواد۔ متن اور سیرت کی پیشکش میں وہی خامی موجود ہے
ہے جو اردو کے دیگر ابتدائی تذکروں میں دکھائی دیتی ہے۔ شعراء کے حالات اور واقعات
کے بیان میں تاریخی استدلال کی کمی۔ سینین اور تاریخ کا عدم استعمال مختصر تعارف
کا انداز ترتیب، کلام میں غیر جامعیت اور ایسی ہی دیگر کئی بے ضابطگیاں ہیں جو اس
تذکرہ کو ابتدائی ہونے کی وجہ سے قابل معافی سمجھی جاسکتی ہیں۔ حنیف نقوی کا اعتراض
اس تذکرہ کو اردو کے تذکروں میں شمار نہ کیا جائے کہ اس وجہ سے قطعی غلط ہے کہ کسی
بھی کتاب میں مواد کی کثرت و قلت پر فیصلہ صادر کرنا دور جدید کی خصوصیت ہے
جبکہ قدیم زمانے میں اس قسم کا التزام نہ تھا اسی لیے تحفۃ الشعراء کو اردو
تذکروں میں شمار کرنا صرف ادبی تاریخ کی تدوین کا حق ادا ہونے کے برابر ہے بلکہ اس کی
وجہ سے دکنی تذکروں میں ایک نئے پن کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

غرض دکنی تذکروں نے قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی،
برید شاہی، عالمگیری اور آصف جاہی دور کے ذریعہ ارتقاء حاصل کیا۔ ان تمام ادوار
میں آصف جاہی دور کے ذریعہ ارتقاء حاصل کیا۔ ان تمام ادوار میں آصف جاہی دور
کو اس لیے اولیت حاصل ہے کہ اسی عہد میں دکن میں بیشتر تذکرے لکھے گئے۔ ان کے

علاقہ دکن میں کچھ ایسے دور رہے ہیں جو گمنامی کی حد تک مشہور ہیں جیسے بہمنی دور ۱۳۴۷ء تا ۱۵۲۸ء، گجرات کا مظفری دور ۱۳۹۶ء تا ۱۵۷۲ء میں خاندیس کا فاروقی دور ۱۳۸۲ء تا ۱۶۰۱ء۔ مالوہ کا غوری دور ۱۳۹۲ء تا ۱۵۳۱ء یہ تمام دور دکن کے احاطہ میں آتے ہیں۔ لیکن انہوں نے دکنی ادب کی ترقی کے لیے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ البتہ بہمنی دور اور مظفری دور میں دکنی نثر و نظم کے نمونے مل جاتے ہیں لیکن تذکرے کیاب ہیں اسی طرح مدراس میں بھی مسلمانوں کا تسلط رہا لیکن دور قدیم میں کوئی ادبی کارنامہ ظاہر نہیں ہوئے۔ مستقبل کی تحقیق شاید یہ ثابت کر دے کہ ان قدیم دکنی علاقوں میں بھی کسی دور میں دکنی زبان کا بول بالا رہا ہے۔ اس طرح دکنی تذکرے علاقہ دکن میں سب سے پہلے ۱۵۷۷ء میں ظہور میں آئے اور جب سے آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے۔ آصف جاہی دور کے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں تحریر کردہ تذکرے شائع ہو چکے ہیں اسی لیے انھیں زیر بحث لانے کی بجائے مقالہ کے میں بطور فہرست شامل کیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور آصفی میں سب سے زیادہ اُردو کی نمائندگی ہوئی اور علاقہ دکن میں اسی دور میں سب سے زیادہ تذکرے لکھے گئے۔ اردو میں دیگر علوم و فنون کو پھیلانے کے ساتھ ساتھ اُردو کو تذکرہ دکن کا جیسٹس بہاؤ خیر عطا کرنے کی وجہ سے دور آصفی کی یاد تازہ رہے گی۔

باب الحکم

غیر مطبوعہ دکنی تذکروں کا قیمتی جائزہ

دکنی تذکروں کے تحقیقی جائزے اور تنقیدی اظہار سے اندازہ قائم ہوتا ہے کہ دکن میں نہ صرف مذہبی اور سوانحی تذکرے لکھے گئے تہذیب اور تمدن کی روایت کو بھی تذکروں میں قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ دکنی تذکرے نہ صرف ایک عہد کا یادگار ہیں بلکہ اس عہد کی تہذیب اور تمدن کے بھی نمائندہ ہیں یہی وجہ ہے کہ دکنی تذکروں کی غیر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فہرست کے جائزے سے اندازہ قائم ہو جاتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے تذکرہ کی روایت کو فن سے زیادہ تہذیب سے مربوط رکھا۔

دکن میں موجود مخطوطات اور مطبوعات کی طویل فہرست میں تذکرہ کا فن اپنی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ دکن کے قلمی تذکروں میں ادبی، مذہبی، سیاسی اور سماجی حیثیتوں کے کارنامے محفوظ کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض تذکروں میں صرف کلام کے انتخاب پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ ذیل میں دکنی قلمی تذکروں کی تفصیل وضاحت کے ساتھ پیش کی جاتی ہے تاکہ کتب خانوں میں محفوظ دکنی تذکروں میں موجود مواد اور متن کے ساتھ تذکرہ نگار کے انداز اور اس کے مزاج سے

واقفیت حاصل ہو سکے۔ ان غیر مطبوعہ دکنی تذکروں کے تعارف کے دوران ابجدی ترتیب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

آثار الاوتان :

تاریخی انداز پر تحریر کردہ یہ تذکرہ سالار جنگ میوزیم لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں ۵۱۱ نمبر پر محفوظ ہے۔ یہ تذکرہ سلسلہ ص کے بعد لکھا گیا جس کے مولف سید محمد محی الدین خاں اورنگ آباد عدالت کے ناظم صدر تھے۔ چھ ابواب پر مشتمل اس تذکرہ میں پہاڑوں پر تعمیر شدہ کل پچھتر مورتیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ۱۹۴ صفحات پر مشتمل اس تذکرہ میں ہر باب کے ساتھ مختلف مقامات کے مندروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہر ورق کے بعد مقدمہ اور پھر کوہستانی مندروں کے بانیوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ ہر فرقہ کے افراد کی دیویوں کی علامتوں کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے پہلے حصہ میں جنوبی ہند (دکن) کے مختلف مقدس معابدوں کا ذکر کرتے ہوئے مولف نے ہندو مذہب کے پچھتر، فرقوں کے نام گنوائے ہیں اور پھر اورنگ آباد کے مندروں کے ساتھ ساتھ ایلورہ اور اجنتا کے غاروں کے معابدوں کے بارے میں مختصر معلومات فراہم کی ہیں۔ اس پہلے حصے میں چار مختلف ابواب کے ذریعہ مولف نے تشریحی انداز اپنایا ہے۔ چنانچہ حصہ اول میں اورنگ آباد کے مندروں کا بیان، حصہ دوم میں ایلورہ کی عالی شان عمارتوں اور تراشیدہ غاروں کا ذکر، حصہ سوم میں اجنتا کے انتیس غاروں کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ مہابیاں فرقہ کے مخصوص غاروں کی بھی وضاحت کی ہے۔ جبکہ حصہ چہارم میں کروسہ اور مومن آباد کے غاروں کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ اس طرح "آثار الاوتان" کے ابتدائی حصہ میں ہندوستان کے مشہور غاروں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ہندو مذہب کے مختلف معابدوں کی پرستش کی جاتی ہے۔

ایک لحاظ سے یہ تذکرہ ہندو مذہب کی عبادت گاہوں کے بارے میں مختصر تاریخچہ پیش کرتا ہے۔

"آثارالاولیاء" کے دوسرے حصہ میں پانچ ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ جو کے ذریعہ برٹس انڈیا کے چونتیس مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جہاں پہاڑی علاقہ برہمپور کی پوجا کی جاتی ہے۔ باب اول میں مدراس، بجاوڑ، مہاولی پور کی کوہستان مندروں کا ذکر ملتا ہے۔ باب دوم میں برابار، راجگڑھ، سیٹا مرہٹی اور بارہ کے غاروں اور معابدوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ باب سوم میں بمبئی، ناسک، کار اور مہار سے متعلقہ غاروں کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ اسی طرح باب چہارم میں کٹک کے غار۔ باب پنجم میں کاٹھیاواڑ کے غار اور باب ششم میں راجپوتانہ کے غاروں اور پہاڑوں پر تعمیر کردہ مندروں کے ذکر کے ذریعہ مولف نے یہ وضاحت کی ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو شاعروں اور ادیبوں کے حالات پیش کرنے کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ قومی یادگاروں کو محفوظ رکھنے کا واحد ذریعہ بھی بتا دیا۔ "آثارالاولیاء" دکنی تذکروں میں کسی قوم کی تعمیر یادگاروں کو محفوظ رکھنے کی وجہ سے منفرد مقام کی حامل ہے۔

تذکرہ جوهہ فرد:

یلح آباد کے شاعروں کے کلام کو جمع کر کے سید محمد علی یلح آبادی نے اس تذکرہ کے ذریعہ بغیر کسی ابجدی ترتیب کے کلام کی ترتیب کو ہی تذکرہ کا درجہ دے دیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری کی قلمی کتابوں میں اس کی سنہ تالیف ۱۹۰۹ء میں درج کی گئی ہے۔ صفحہ ۱۵۵ مولف نے مقدمہ میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ ۹۔ ربیع الاول ۱۳۲۶ھ کو حیدرآباد سے یلح آباد پہنچے مختلف مشاعروں میں شرکت۔

بعدا نہیں یہ ذوق پیدا ہوا کہ ملیح آباد کے شاعروں کے کلام کو یکجا کیا جائے جس کے نتیجہ میں ان کا یہ تذکرہ عالمِ ظہور میں آیا۔ مقدمہ میں مولف نے وضاحت کر دی ہے کہ مختصر سے قیام کے دوران ملیح آباد کے شعراء کے حالات اور ان کے کارنامے یکجا کرنے کا کوئی موقع دستیاب نہیں ہوا۔ اسی لیے کلام کی ترتیب پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مولف کے اس اظہار سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس تذکرہ میں صرف شاعروں کے منتخب کلام کو محفوظ کرنے پر توجہ دی۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ تذکرہ میں ابجدی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا۔ ہر صفحہ پر جلی حروف میں شاعر کا نام اور اس کے تخلص کے ساتھ غزل کے نمونے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ تقریباً چونتیس شعراء کے کلام کو ۳۰۰ صفحات پر ترتیب دیا گیا ہے یہ تذکرہ اس وجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے مطالعہ سے ۱۹۰۹ء میں ملیح آباد میں موجود شعراء کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ چونکہ اس تذکرہ کو حیدرآباد میں مقیم مولف نے لکھا ہے۔ اسی لیے اس کا شمار دکنی تذکروں میں کیا جاتا ہے۔

"تذکرہ جو ہر فرد" کا مکمل متن شعرائے ملیح آباد کے بارے میں منتخب کلام کو پیش کرتا ہے۔ لیکن اس کا شمار اس وجہ سے دکنی تذکروں میں کیا جائے گا کہ سید محمد علی ملیح آبادی نے حیدرآباد سے سفر کے بعد اس تذکرہ کو تحریر کیا۔ دکنی تذکروں میں یہ واحد تذکرہ ہے جس کی ترتیب کے لیے مولف نے نہ صرف سفر اختیار کیا بلکہ ملیح آباد کے شعراء کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے تحقیقی طریقہ بھی اپنایا۔ اردو کے تمام تذکروں میں یہ روایت پائی جاتی ہے کہ تذکرہ نگار اپنے وطن میں بیٹھ کر دیگر مقامات کے شعراء کے بارے میں مواد فراہم کرتے ہیں جس سے حقائق میں غلو شامل ہونے کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ دکن کے بہت کم تذکرے ایسے ہیں جن کی ترتیب کے موقع پر مولف نے عملی طور پر اپنی ذات کو شعراء کے حالات جمع کرنے کے لیے متحرک رکھا ہے

بلکہ شمالی ہند کے تذکروں میں بھی ایسی مثال کیاب ہے۔ اس تذکرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویس متن کی پیش کشی کے وقت عملی اقدام کو بھی خصوصی اہمیت دیتے تھے۔ ”تذکرہ جوہر فرد“ دکنی تذکروں میں اس حیثیت سے انفرادی مقام رکھتا ہے کہ اس ترتیب میں شخصی دل چسپی کا عکس اور عملی اقدام کی جھلک دکھائی دیتی ہے جبکہ اردو کے تمام تذکروں میں متن کی فساد ہی کے دوران عملی اقدامات کا عام طور پر فقدان ہے۔

تذکرہ خاندان نواب رفعت الملک :

امیر و امراء کے خاندان اور ان کے حسب نسب کے علاوہ ان کی قابلیت کے بارے میں تذکرہ لکھنے کی روایت دکن ہی میں پروان چڑھی چنانچہ حکیم شمس اللہ قادری ایک ایسے نامور مورخ گذرے ہیں جنہوں نے تاریخی استدلال کے ذریعہ تذکرہ کی روایت میں تحقیق کے انداز کو شامل کیا۔ ”تذکرہ“ خاندان نواب رفعت الملک ” اسی خصوصیت کی یادگار ہے۔ ۱۹۳۷ء میں تحریر کردہ یہ تذکرہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کی قلمی کتب میں محفوظ ہے۔

حکیم شمس اللہ قادری نے اس تذکرہ میں نواب رفعت الملک کے خاندانی حالات کے ساتھ ساتھ نواب دکن الدولہ، سید لشکر خان وزیر اعظم امیر الممالک، آصف الدولہ، نواب صلابت جنگ کے حالات بھی قلمبند کیے ہیں۔ ابتدائی طور پر نواب کے خاندانی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے حسب نسب اور کارناموں کی وضاحت کی گئی ہے۔ تاریخی انداز کے اس تذکرہ میں فارسی، اردو اور انگریزی کتب میں سے استفادہ بھی کیا گیا ہے۔ اور کتاب کے آخر میں نواب رفعت الملک کا خاندانی شجرہ بھی درج کیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ حیدرآباد کے ایک جاگیردار خاندان کا تذکرہ ہے جو نہایت تحقیق اور جستجو کے بعد تحریر کیا گیا ہے۔ اس خاندان کے آخری مشہور فرد

میر ہاشم علی خان ہائیکورٹ کے جج تھے اور ان کے فرزند عالم علی خاں بودھن شوگر فیکٹری کے اعلیٰ عہدہ دار رہے ہیں۔ اس تذکرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن کے تذکرہ نویسوں نے صرف مذہبی اور ادبی تذکرے نہیں لکھے بلکہ جاگیر دار خاندان کے حالات کو بھی تذکرہ کے روپ میں پیش کیا۔ شمس اللہ قادری کا یہ تذکرہ دکن کے شاہانہ خاندان کے حالات اور ان کے جاہ و جلال کا پتہ دیتا ہے۔ اس تذکرہ کو خاندانی تذکرہ کا نام دیا جاسکتا ہے۔

تذکرہ خوش نویسیاں :

کتابت اور خوش خطی کے فن کی تاریخ اور تحریر کے مختلف طریقوں کے علاوہ خط نسخ، خط کوفی اور خط نستعلیق کے بانی اور ان کی طرز تحریر کو بامعروض تک پہنچانے والے مختلف خوش نویس حضرات کی مختصر سوانح اور ان کے کارناموں کو مرزا محمد علی نے "تذکرہ خوش نویسیاں" کے نام سے ترتیب دیا ہے۔ سالار جنگ میوزیم لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ یہ تذکرہ ۱۳۲۳ھ میں تالیف کیا گیا۔ مولف نے مقدمہ میں وضاحت کر دی ہے کہ اس تذکرہ کی تالیف کا اصل سبب مقامی حکومت کی جانب سے اعلان کردہ ایک مراسلہ ہے جس کے ذریعہ آصفیہ سلطنت کے سربراہوں نے خوشنویسی کی تاریخ اور اس فن میں یکتائے روزگار افراد کی سوانح ترتیب دینے پر خصوصی توجہ دی تھی۔ مرزا محمد علی نے اس تذکرہ کے ذریعہ کوشش کی ہے کہ مختلف خوشنویسوں کی تاریخ مدون کی جائے۔

مرزا محمد علی نے اس تذکرے میں خوشخطی کی ابتدا اور عرب و ایران میں اس کے ماہرین کی مختصر تاریخ کو پیش کرتے ہوئے تقریباً پچیس خوشنویسوں کے مختصر

حالات درج کیے گئے ہیں۔ جس کے ساتھ ہی خوش نویسی کے آٹھ طریقوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان خطوط کے بانی اور ان کے کارناموں کے جائزے کے ساتھ ساتھ دنیا کے مختلف ممالک میں خوشنویسوں کی کارگزاریوں کے بارے میں مختصر ذکر بھی کیا گیا ہے۔ مؤلف نے ہر خوشنویس کی سوانح جمع کرنے سے زیادہ ممکنہ طور پر تاریخ پیدائش اور وفات درج کر دی ہے۔ ۷۴ صفحات پر مشتمل اس تذکرہ میں ۳۲ حصے کر سنہ تالیف تک کے مشہور خوشنویسوں کا مختصر مگر جامع ذکر کیا گیا ہے۔

اس تذکرہ میں خوشنویسوں کی شخصیت کے بارے میں مواد فراہم نہیں ہوتا لیکن اس کی اہمیت اس وجہ سے دیا جاتا ہے کہ اردو تذکروں میں یہہ واحد تذکرہ ہے جس کے ذریعہ خوشنویسوں کے حالات کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ فی اعتبار سے اس تذکرہ میں کئی خامیاں موجود ہیں لیکن اردو میں سب سے پہلی مرتبہ خوشنویسوں کے حالات یکجا کرنے کی وجہ سے یہ تذکرہ انفرادی حیثیت کا حامل ہو گیا ہے۔ مؤلف نے اس تذکرہ میں خوشنویسوں کے حالات کے علاوہ خوشنویسی کے فن کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ تذکرہ کے آخر میں خوشخطی کی شناخت، شان و شیوہ اور سواد قلم کے زیر عنوان فن خوشنویسی پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مؤلف کے نزدیک تحریر کی خوب صورتی، رخ، کرسی، شکل اور زہد قلم سے عبارت ہے۔ خوش خطی کے اصول مدون کرنے کی وجہ سے مرزا محمد علی صرف تذکرہ نگار ہی نہیں بلکہ فن خوشنویسی کے پہلے نقاد قرار پاتے ہیں۔ مرزا محمد علی دکن کے مشہور خوش نویس تھے اور دفتر صدر محاسب میں منصب دار دیوان اور صبیغہ دار کے عہدوں پر فائز تھے۔

ان کے تذکرہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک باشعور

خوش نویس ہونے کے علاوہ فن تحریر کے بارے میں دقیق معلومات بھی رکھتے تھے جس کی بہترین مثال دکنی تذکرہ "تذکرہ خوش نویس" ہے جس میں فن خوش نویسی کی تاریخ، خوش خطی کے موجدین اور مشہور زمانہ خوش نویسوں کے مختصر حالات اور ان کے کارناموں کو اکٹھا کیا گیا ہے۔ اردو کے بیشتر تذکرے شاعروں اور ادیبوں کے حالات اور کارناموں کے نمائندہ ہیں۔ جبکہ "تذکرہ خوش نویس" اردو کا پہلا تذکرہ ہے جس میں خوش نویسوں کے ذکر کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس انفرادی خصوصیت کی وجہ سے "تذکرہ خوش نویس" دکنی تذکروں میں فن تذکرہ کی عام ڈگر سے بالکل مختلف ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کے بجائے خوش نویسوں کے تذکرہ کی ترتیب دکنی تذکروں میں ایک اہم اضافہ کا درجہ رکھتی ہے۔ جس کی بہترین مثال "تذکرہ خوش نویس" سے دی جاسکتی ہے جو دکنی تذکرہ کے فن کو متحرک رکھنے کے لیے دکن کے تذکرہ نگاروں کی جدوجہد کا مظہر ہے۔

تذکرہ شعراء:

ہم عصر علماء اور شعراء کے حالات قلمبند کرنے کے لیے شیخ محمد علی حزیں نے "تذکرہ شعراء" لکھا۔ جو ادارۂ ادبیات اردو کے شعبیہ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ ۱۶۵ھ میں تصنیف شدہ اس تذکرہ کی کتابت سید محمد الحسینی نے ۸۹ھ میں بمقام اورنگ آباد انجام دی۔ شیخ محمد علی حزیں اصفہان کے رہنے والے تھے۔ ۱۰۳ھ میں ہندوستان تشریف لائے اور اس دور کے معاصرین کے کارناموں کو "تذکرہ شعراء" کے زیر عنوان ترتیب دیا۔ اس تذکرہ میں ۱۱۲ شعراء کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ مولف نے تذکرہ کو دو فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی فصل میں معاصرین علماء کا ذکر موجود ہے جبکہ دوسری فصل میں معاصرین

شعراء کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ اس تذکرہ میں اکثر علماء اور شعراء ایران سے تعلق رکھتے ہیں لیکن متعدد ایسے ہیں جو ہندوستان آئے تھے اور بعضوں نے اردو میں بھی شعر کہے ہیں۔ مؤلف نے تذکرہ میں اس بات کی صراحت بھی کر دی ہے کہ ایسے شعراء جن میں مؤلف کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کے اشعار درج کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی سوانح کے بارے میں اشاروں سے کام لیا گیا ہے۔ کئی تذکروں میں معاصرین کے حالات پیش کرنے میں تذکرہ شعراء اپنی انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔

تذکرہ کی آخری عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مؤلف نے اس تذکرہ کی میں صرف نو دن میں کی۔ اس تذکرہ کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے کہ تصنیف کے صرف ۲۴ سال بعد اس کی کتابت عمل میں آئی۔ کاتب سید محمد الحسینی تھے مرزا محمد کرم علی کی فرمائش پر اس تذکرہ کو خود مؤلف کے اصل نسخہ سے نقل کیا ہے۔ تعلق شکستہ خط میں کاتب نے عنوانات کو سرخ روشنائی سے ظاہر کیا ہے اور کتابت کے لیے دولت آبادی کا غذا استعمال کر کے روشن سیاہی کے ذریعہ مخطوطہ کو خوب صورت بنایا گیا ہے۔

شیخ محمد علی حزیں کا تعلق اصفہان سے تھا لیکن وہ اپنی آخری عمر میں ہندوستان آئے اور جنوبی ہند کی قطب شاہی سلطنت سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے تذکرہ میں حروف تہجی کا التزام نہیں ہے۔ انھوں نے فرقہ علماء کی فصل کا آغاز ہندوستان کے مشہور عالم صدر الدین سید علی خاں سے کیا ہے جو عبداللہ قطب شاہ کے داماد اور نظام الدین احمد دشتکی کے فرزند تھے اور جنہوں نے اپنی بیشتر عمر حیدرآباد میں گزاری تھی۔ غرض یہ تذکرہ عام نوعیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ شیخ محمد علی حزیں نے اس تذکرہ میں جدت پسندی کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ عام روایتی انداز سے تذکرہ کی ترتیب پر توجہ دی۔

تذکرہ شعراء اپنی مخصوص پہچان کی وجہ سے انفرادیت رکھتا ہے۔ اگرچہ مؤلف

نے اس تذکرہ کا نام "تذکرہ شعراء" رکھا ہے لیکن علماء اور شعراء کے ارتباط کے ذریعہ اس تذکرہ کو گلدستہ بنا دیا ہے۔ علماء اور شعراء کے اختلاف کے ذریعہ اس تذکرہ کو گلدستہ بنا دیا ہے۔ عام طور پر اردو کے تمام تذکرے یا تو شعراء کے حالات پیش کرتے ہیں، یا ہر علماء اور صوفیاء کے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ لیکن شیخ محمد علی حزیں کے اس تذکرہ کی اہم خصوصیت یہی ہے کہ اس تذکرہ میں علماء اور شعراء کے حالات کو یکجا کیا گیا ہے۔ دور قدیم سے ہی داعظاؤ شعراء میں اختلاف چلا آیا ہے اور اکثر شعراء نے رند مشرب خیالات کے ذریعہ مذہبی روایت کو توڑنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ رہا کہ شاعری نے مذہبی تصورات سے انحراف کیا۔ محمد علی حزیں کے تذکرہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اردو کے پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے مذہبی علماء اور شعراء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش کی "تذکرہ شعراء" میں اس کی عملی مثال موجود ہے جس سے واضح ثبوت ملتا ہے کہ جنوبی ہند کے تذکرہ نویسوں نے اردو تذکرہ کے فن کو انفسادیت دلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس امتیازی خصوصیت کی وجہ سے شیخ محمد علی حزیں کی تالیف "تذکرہ شعراء" دکنی تذکروں میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔

تذکرہ طوطیان ہند

دکنی تذکروں میں یہ واحد تذکرہ ہے جس کے ذریعہ (خواتین) شاعرات کے حالات اور ان کا کلام یکجا کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ ادارہ ادبیات اردو کی قلمی کتابوں میں محفوظ ہے اور اس کا "تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو" کی جلد پنجم میں کیا گیا ہے۔ مولانا تمکین کاظمی نے ۱۹۲۸ء میں اس تذکرہ کی ترتیب کا آغاز کیا جس کی تکمیل ۱۹۳۶ء میں ہوئی اس تذکرہ میں اردو زبان کے آغاز سے لے کر عہد حاضر تک اردو شعراء کی خواتین کا ذکر موجود ہے۔ مولف نے خواتین کے غزلوں کو حروف ابجد کے لحاظ

سے ترتیب دے کر ان کے حالات اور نمونہ کلام درج کیا ہے۔ اس تذکرہ میں تقریباً ۳۷۵ شاعرات کے احوال اور نمونہ کلام شریک ہے۔ تذکرہ کا آغاز اختر کے کلام سے ہے اور متعدد گمنام شاعرات کے کلام کے نمونوں پر تذکرہ کا اختتام عمل میں آیا ہے۔ یہ تذکرہ خود مؤلف کا مسودہ ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اس تذکرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی ضخامت اور متن کی تعریف کی ہے۔

مولانا تمکین کاظمی حیدر آباد کے نامور اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا ادبی شغف شعروشاعری رہا لیکن اس تذکرہ کی ترتیب کے ذریعہ انھوں نے شاعرات کے کلام کو اکٹھا کر کے دکنی تذکروں کی روایت میں گونا گوں اضافہ کیا ہے۔ اس تذکرہ کی اہم خصوصیت یہی ہے کہ دکن میں ترتیب دیے جانے کے باوجود اس تذکرہ میں بیشتر شمالی ہند کی شاعرات کا بھی ذکر موجود ہے۔ مولانا کاظمی نے ممکنہ طور پر شاعرہ کے حالات جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ متن کی عدم دستیابی کی صورت میں گمنام شاعرات کا کلام بطور نمونہ پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف نے ادبی دیانت داری سے کام لیا ہے۔ دکنی تذکروں میں "تذکرہ طوطیان ہند" شاعرات کا ذکر ہونے کی وجہ سے انفرادیت رکھتا ہے۔

تذکرہ کی روایت اور فنی اصول "تذکرہ طوطیان ہند" میں پوری طرح واضح ہیں۔ مؤلف نے متعین کلام کے ذریعہ اپنے ادبی مزاج کا ثبوت دیتے ہوئے اس تذکرہ میں ایسی شاعرات کو بھی جگہ دی ہے جن کا ذکر اس سے قبل کسی اُردو تذکرہ میں موجود نہیں مولانا تمکین کاظمی کا یہ تذکرہ اس حیثیت سے دکنی تذکروں میں اہمیت کا حامل ہے کہ مؤلف نے پہلی بار اُردو کی خواتین شاعرات کے حالات اور کلام کو یکجا کرنے پر توجہ دی۔ اسی انفرادی حیثیت کی وجہ سے "تذکرہ طوطیان ہند" دکن کے ممتاز تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

تذکرہ عطاے تمکین

دکن میں تحریر کردہ اس تذکرہ کو "تذکرہ شاگرداں" کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس تذکرہ میں شاہ نصیر اوران کے شاگرد، حافظ تاج الدین مشتاق اوران کے شاگرد کے علاوہ حافظ میر شمس الدین فیض اوران کے سلسلے کے ۳۵۱ شعرائے حالات اور نمونہ کلام درج کیا گیا ہے۔ سید محی الدین قادری زور نے اس تذکرہ کا نام "تذکرہ عطاے تمکین" رکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تذکرہ تمکین کاظمی کا عطیہ ہے۔ درحقیقت اس تذکرہ کا کوئی عنوان نہیں اور نہ ہی اس پر تاریخ تالیف درج ہے۔ مولانا تمکین کاظمی نے ۱۲ ستمبر ۱۹۵۸ء کو یہ تذکرہ اپنی دستخط کے ساتھ ادارہ ادبیات اردو کے حوالے کیا۔ کیونکہ اس تذکرہ میں شعراء کی تاریخ وفات کے سلسلے میں ۱۲۹۲ھ آخر میں درج ہے۔ اسی لیے سنہ تالیف کا اندازہ اسی تاریخ کو برقرار دیا گیا ہے۔ مولانا تمکین کاظمی نے درمیانی اوراق پر حسب ذیل تحریر درج کی ہے۔

"یہ ایک تذکرہ ہے جس کا کچھ حصہ حکیم بہود علی صاحب صفی مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اس پر نوٹس ابو محمد عمر الصلاح یافعی نے بھی لکھے ہیں۔ یہ بھی اسی حالت میں پرانی کتابوں کی دکان سے ملا جسے میں ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں محفوظ کر دار ہا ہوں تاکہ کام آسکے۔" ۱۰

اس تحریر کے آخر میں تمکین کاظمی نے شرح دستخط کے ساتھ تاریخ بھی درج کر دی ہے۔ اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن میں لا تعداد تذکرہ لکھے گئے اور ان کے بیشتر مسودات ردی کے حوالے ہو گئے۔ اگر اس تذکرہ کو مولانا تمکین کاظمی تلاش

نہ کرتے تو یہ بھی ضائع ہو جاتا۔

دکنی تذکروں میں اس تذکرہ کو اس لیے خصوصی اہمیت حاصل ہے کہ اس تذکرہ میں صرف حیدرآباد کے اردو شاعروں کا ذکر ہے۔

اس کے علاوہ مولف نے حیدرآباد کے تین

بڑے اساتذہ کے شاگردوں کا اس تذکرہ میں جگہ دی ہے کیونکہ یہ تذکرہ صرف شاگردوں کے احوال پیش کرتا ہے اور اردو تذکروں میں اس قسم کا کوئی تذکرہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا اسی لیے تذکرہ عطاءے تمکین، اساتذہ شعراء سے اکتساب کرنے والے شاگردوں کا نام تذکرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس میں شاگرد شعراء کے حالات اور ان کے کلام کو پیش کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دکنی شعراء کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہوتی تھی اور وہ ادب اور فن کی خدمت کو اپنا خصوصی مسلک سمجھتے تھے۔ دکن میں تحریر کردہ یہ تذکرہ اردو کے دیگر تذکروں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

ریاضِ حسنی :

دکنی تذکروں میں نوادرات کی حیثیت رکھنے والا یہ تذکرہ سنٹرل ریکارڈ

آفس حیدرآباد کی لائبریری میں محفوظ ہے اور اس کا شمار بھی ان نایاب تذکروں میں کیا جاتا ہے جو طباعت سے محروم ہیں۔ اس تذکرہ کے مولف خواجہ عنایت اللہ فوت ، اورنگ آباد کے موطن اور سرکار آصفیہ کے منصب دار تھے۔ اس تذکرہ پر ڈاکٹر حنیف نقوی نے اپنی کتاب شعراءِ اردو کے تذکرے میں تفصیلی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ تذکرہ انارکلی لائبریری اور غلطیوں اور تحریر کے بے شمار نقائص سے بھرپور ہے اور ریکارڈ آفس کی فہرست مخطوطات میں نصیر الدین ہاشمی نے ”ریاضِ حسنی“ کو مکمل تذکرہ بتایا ہے۔ جب کہ تذکرہ کا آغاز صفحہ ۱۷۳ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح حنیف نقوی نے اس تذکرہ کی

شان نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ خواجہ محمد اکرام نے سید عبدالولی عزالت کے کتب خانہ سے متعدد دواوین اور تذکرے عنایت اللہ فوت کے حوالے کیے جن کے مطالعہ کے بعد فوت نے یہ تذکرہ لکھا۔ جس میں شاعروں کے حالات درج ہیں۔

ڈاکٹر حنیف نقوی نے ”ریاض حسنی“ کی شان نزول پر بحث کے لیے جو طریقہ اپنایا ہے وہ درحقیقت ایک طرفہ تنقید کا ائقنہ دار ہے۔ کیونکہ حنیف نقوی نے بتایا ہے کہ مختلف تذکروں کے مطالعہ کے بعد عنایت اللہ فوت نے یہ تذکرہ بطور کتابی شکل تحریر کیا۔ حنیف نقوی کے نزدیک یہ عمل قابل ستائش نہیں جبکہ کامیاب تذکرہ کی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ متعدد کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھا جاتا ہے اور فوت نے اس عمل کو برقرار رکھتے ہوئے یہ تذکرہ لکھا ہے۔ مختلف دواوین اور تذکروں کے مطالعہ کے بعد ”ریاض حسنی“ جیسا تذکرہ لکھنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ مؤلف نے جگر کا دی کے ساتھ اس تذکرہ کو ترتیب دیا ہے جبکہ حنیف نقوی اس عمل کو کسی قدر گراں باری سے دیکھتے ہیں۔

”شعراے اردو کے تذکرے“ میں حنیف نقوی نے ”ریاض حسنی“ کے دیباچہ اور تذکرہ کے متن پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”دیباچہ میں جواہر اور قابل ذکر امور زیر بحث آئے ہیں ان کا اہصل یہ ہے کہ عمر کی ایک ایسی منزل میں جبکہ ”انتشارِ حواس“ اور ابتدائے تاوانی“ کے باعث زندگی کی تمام رنگینیاں گریز پانی پر مائل تھیں اور ”وحشت مزاج“ کسی طرح شکستیاں سے آشنا نہ ہوتی تھی۔ خواجہ محمد اکرام نے سید عبدالولی عزالت کے کتب خانہ سے جو ان کے زیرِ نظر تھا، شعراے متقدمین اور متاخرین کے دواوین اور بعض دوسری کتابیں مہیا کر کے مؤلف کے لئے ”دبستان“ اور قفرِ طبع کا صفا مان فراہم کیا

ان کتابوں میں سراج الدین علی خاں آندرو کا تذکرہ "جمع التفاسیر" بھی تھا جو مطالعہ کے بعد ان کے دل میں "ایجادِ تذکرہ ہندی" کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ دسترس کے حدود میں رہتے ہوئے انھوں نے مختلف مشاعروں کے حالات اور اشعار جمع کیے اور انہیں ایک تذکرہ کے طور پر کتابی صورت میں مرتب کر دیا۔ مختصراً یہی اس تذکرہ کی شانِ نزول ہے۔" ۱۷

ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس بیان کے ذریعہ مختصر طور پر "ریاضِ حسنی" کے دیباچہ کو جامع طور پر واضح کیا ہے۔ لیکن دبے دبے الفاظ میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ عنایت اللہ فوت کا یہ تذکرہ تالیف سے زیادہ تواتر کی حیثیت رکھتا ہے، جبکہ اردو کے تمام تر تذکرے فارسی تذکروں کے تتبع میں لکھے گئے اور بیشتر تذکروں میں دیگر تذکروں سے استفادہ کا عمل صاف طور پر ظاہر ہے۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بہترین اور جامع تذکرے کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ متن کی پیش کشی میں کئی تذکروں کے مطالعہ کے بعد لکھا جائے۔ فوت کے الفاظ "ایجادِ تذکرہ ہندی" سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے مطالعہ کے بعد "ریاضِ حسنی" مرتب کیا۔ اس خصوصیت کی بنا پر فوت اردو کے پہلے محقق تذکرہ نگار قرار پائیں گے۔ کیونکہ انہوں نے "ریاضِ حسنی" کی ترتیب کے لیے مختلف تذکروں کا مطالعہ کیا۔

"ریاضِ حسنی" کے مطالعہ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ خواجہ عنایت اللہ فوت اردو کے پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے ادبی دیانت داری کا ثبوت

دیتے ہوئے اپنے دیباچہ میں صاف صاف بیان کر دیا کہ کسی قدر مطالعہ کے بعد ان کی طبیعت ایک نیا تذکرہ ایجاد کرنے کی جانب مائل ہوئی۔ اس کے علاوہ تالیف کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ مختلف کتابوں کے مطالعہ کے بعد ظہور میں آتی ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے شعرائے اُردو کے تذکرے میں گرویزی اور فتوت کی تحریروں کا تقابل بھی کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ”ریاضِ حسنی“ ترجمہ شدہ تذکرہ ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گرویزی اور فتوت کے تذکروں میں بعض شعرائے حالات کی ترتیب میں کسی قدر الفاظ میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر حنیف نقوی کا یہ بیان کہ فتوت نے دیدہ دلیری کے ساتھ تذکرہ گرویزی کے مشتملات پر شیخوں مارا ہے۔ کسی حد تک بے ادبی کی دلیل ہے۔ فتوت پر سرقے کا الزام قطعی غلط ہے کیونکہ انھوں نے گرویزی کے تذکرے جامع ترین انداز کو اپنایا ہے۔

”ریاضِ حسنی“ کی تاریخ تصنیف کے بارے میں بھی ڈاکٹر حنیف نقوی نے طویل بحث کے ذریعہ نصیر الدین ہاشمی کے متعین کردہ سنہ تالیف ۱۱۷۵ھ کو غلط ثابت کیا ہے۔ اور مختلف بیانات کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ فتوت کا یہ تذکرہ درحقیقت ۱۱۷۲ھ میں تالیف کیا گیا۔ نصیر الدین ہاشمی کے مضمون میں سنہ تالیف ۱۱۷۵ھ دردرج ہے جو سہواً لکھی گئی ہے۔ درحقیقت ۱۱۷۵ھ نسخہ کی کتابت کی تاریخ ہے۔ اس طرح ”ریاضِ حسنی“ کی تاریخ تالیف ۱۱۷۳ھ قرار پاتی ہے جس کے نتیجے میں نصیر الدین ہاشمی کی وضع کردہ تاریخ غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ یلعریاضِ حسنی فتوت کا کوئی عظیم کارنامہ نہیں اور نہ ہی اس تذکرہ سے ادب میں کوئی اضافہ ہوا ہے بلکہ اس کی حیثیت دکن میں تحریر کردہ ایک تذکرہ کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے۔ فتوت کے تذکرہ میں فنی طور پر خامیاں موجود ہیں۔ لیکن تذکرہ نویسی کے فن کو دکن میں فروغ دینے کی وجہ سے فتوت کا تذکرہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔

دکن کی غیر مطبوعہ قلمی کتابوں میں فن تذکرہ سے متعلق موجود مخطوطات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سی دور سے لے کر عہد حاضر تک دکن کے ادیبوں نے لاتعداد تذکرے لکھے لیکن زمانے کی دست برد نے انہیں تباہ کر دیا۔ جنوبی ہند کے کتب خانوں میں محفوظ تذکروں کے علاوہ کئی مذہبی اور ادبی تذکرے شخصی کتب خانوں میں پراگندہ حالت میں موجود ہیں۔ کرنول، مدراس، خلد آباد، برہان پور، بنگلور اور دیگر ایسے مقامات جہاں مذہبی علماء اور اولیائے کام قیام پذیر تھے اب بھی قلمی کتابوں کے ذخیرے موجود ہیں۔ لیکن جن کی تحویل میں یہ کتابیں موجود ہیں وہ بطور تبرک محفوظ رکھنا ان کتابوں کا بہتر استعمال تصور کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ان کتابوں تک پہنچ بہت مشکل کام ہے۔ غرض دستیاب شدہ قلمی کتابوں میں موجود تذکرے "آثار الاوثان"، "تذکرہ جوبہر فرد"، "تذکرہ خاندان نواب رفعت الملک"، "تذکرہ خوش نویاں"، "تذکرہ شعراء"، "تذکرہ طوطیان ہند"، "تذکرہ عطائے تمکین" اور ریاض حسنی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن کا علاقہ فن تذکرہ نگاری کو فروغ دینے کے معاملے میں کافی زرخیز رہا ہے۔ اسی کے نتیجہ میں بیشتر اردو کے تذکرے سرزمینِ دکن سے عالمِ ظہور میں آئے۔ دکن میں تحریر کردہ تمام غیر مطبوعہ تذکرے اپنی انفرادی حیثیت رکھنے کے علاوہ جدت پسندی کے علمبردار بھی ہیں۔ ہر دکنی تذکرہ نگار نے تذکرے کو نئے انداز اور نئی فکر سے وابستہ رکھنے کی کوشش کی۔ اس طرح دکن کے غیر مطبوعہ تذکرے اردو ادب میں اختراعی ذہنیت رکھنے کی وجہ سے اہمیت کے حامل ہو گئے۔

غیر مطبوعہ دکنی تذکروں کا بیشتر ذخیرہ سالار جنگ میوزیم لائبریری اور سنٹرل ریکارڈ آفس کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے کیونکہ دکنی ادب کا بیشتر ذخیرہ زمانے کے تغیرات کے باوجود حیدرآباد میں محفوظ رہا۔ اسی

لیے مخطوطات کی کثیر تعداد یہاں موجود ہے۔ دکنی تذکروں کے مخطوطات میں
 جن افراد کی خصوصیات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دکنی تذکرہ
 نویس اپنے عہد کے دانشور تھے۔ جس کا واضح ثبوت انھوں نے تذکرہ نویسی کے
 دوران دیا۔ غرض دکنی تذکروں کے مخطوطات اردو ادب میں زیریں اضافہ کا درجہ
 رکھتے ہیں۔

ایم

دکنی تذکروں کی امتیازی خصوصیات

جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں تحریر کردہ تذکروں کو دکنی تذکرے کا نام دیا جاتا ہے۔ یعنی دکنی تذکروں سے مراد دکن کے علاقوں میں لکھی گئی وہ تمام کتابیں تصور کی جائیں گی جن سے سٹا عمروں اورادیوں کی سوانح لکھی گئی ہو اور ان کے طرز تحریر کے عنوان پیش کیے گئے ہوں۔ دکن میں لکھے گئے تذکروں کی طویل فہرست ہے۔ جن میں نہ صرف سوانحی مواد دستیاب ہوتا ہے بلکہ دکنی میں شعر و ادب کے عہد کے بارے میں بھی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اگرچہ دکنی تذکروں میں شخصیات اور ان سے متعلق متن کی پیش کشی کا دائرہ محدود ہے لیکن اس حقیقت سے گریز نہیں کیا جاسکتا کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو کئی حیثیتوں سے ہوتا ہے۔ اور لفظ تذکرے کے معنی کو ہم گیر حیثیت دے دی۔ دکنی تذکروں کی امتیازی خصوصیات یہی ہے کہ تذکرہ نویسوں نے دکن میں جس قدر تذکرے لکھے ان میں ہر اعتبار سے فن تذکرہ کو منفرد حیثیت کا حامل بنانے کی کوشش کی۔ دکنی تذکروں میں یہ روایت عام نظر آتی ہے کہ یہاں تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو نہ صرف خصوصی حیثیت دلائے کی کوشش کی بلکہ تذکرہ کی فارسی روایت کو بھی توڑ دیا۔ جس کے نتیجے میں دکنی تذکرہ نویس اس فن کو صرف تاریخ یا سوانح کے طور پر استعمال نہیں کرتے بلکہ تذکرہ کے مفہوم کو وسیع معنی کا علمبردار بنا کر اسے خصوصیت بخشنے میں جن

کی وجہ سے دکنی تذکرے امتیازی حیثیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔

دکن میں تحریر کردہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ لاتعداد تذکروں کا محاکاتی جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ دکن کے تذکرہ نویسوں نے تذکرہ کے لفظ کو تاریخ، سوانح، سیرت، شخصی سوانح، ادبی سوانح، مذہبی سوانح، کارنامہ، ملازمت، تاریخ ادارہ، ذخیرہ معلومات، تاریخ عمارت، تاریخ شجرہ اور تاریخ خطابات کے طور پر استعمال کیا۔ لفظ تذکرہ کو اس ہمہ گیری کے استعمال کرنے کا امتیازی وصف دکنی تذکرہ نویسوں ہی کو حاصل ہے۔ جنوبی ہند کے تذکرہ نویسوں کے مقابلہ میں شمالی ہند کے تذکرہ نگار اس امتیازی خصوصیت کی درڑ میں پچھے رہ جاتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ دکن کے فن کاروں نے تذکرہ کی فنی روایت سے کسی قدر علم و ادب اختیار کرتے ہوئے جدت پسندی کو فن کی خصوصیت میں شامل کیا جب کہ ایسی منفرد مزاجی شمالی ہند کے تذکرہ نویسوں میں کمیاب رہی۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی تذکرے رنگارنگی خصوصیات کے حامل ہیں۔ جن میں سوانح کے ساتھ ساتھ کارناموں اور تاریخ و سیرت کی جھلکیاں بھی پوری طرح واضح ہیں۔ فن تذکرہ کی روایت سے کسی قدر اختلاف کر کے اسے جدت پسندی سے وابستہ کرنا دکنی تذکروں کی امتیازی خصوصیات میں شامل ہے۔ جن خصوصیات کی بنا پر دکنی تذکرے منفرد حیثیت کے حامل قرار دیئے گئے ہیں۔ بطور ثبوت پیش کرنے کے لیے چند عنوانات قائم کیے گئے ہیں تاکہ یہ دلیل پیش کی جاسکے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو کس قدر منفرد مزاجی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

۱۔ تذکرہ بطور کارنامہ ملازمت۔

۲۔ تذکرہ بطور تاریخ ادارہ۔

۳۔ تذکرہ بطور ذخیرہ معلومات۔

۴۔ تذکرہ بطور تاریخ عمارت

۵۔ تذکرہ بطور شجرہ۔

۶۔ تذکرہ بطور خطبہ و خطابات۔

۷۔ تذکرہ بطور سیرت۔

۸۔ تذکرہ بطور شخصی سوانح۔

۹۔ تذکرہ بطور ادبی سوانح۔

۱۰۔ تذکرہ بطور تہذیبی سوانح۔

۱۱۔ تذکرہ بطور تاریخ

دکنی تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو کسی ایک مخصوص صنف کے لیے محدود نہیں رکھا بلکہ لفظ تذکرہ کو اتنی جامعیت بخش دی کہ تذکرہ کافی روایت سے علامہ ہو گیا۔ دکن میں تذکرہ کی روایت ایک علمی دھن کی حیثیت سے فروغ پائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر تذکرہ نویس نے لفظ تذکرہ کی معنویت کو اپنے مخصوص طرز فکر سے وابستہ کر کے روایت شکنی اور فن تذکرہ کی اصولی بندشوں کو لامحدود کر دیا۔

تذکرہ بطور کارنامہ ملازمت :

دکن میں تحریر کردہ تذکروں کی طویل فہرست میں چند ایسے تذکرے بھی ہیں جن میں سوانحی حالات سے زیادہ ملازمت کے کارناموں کو پیش کیا گیا ہے یعنی دکنی تذکرہ نویسوں نے صرف حالات زندگی کی پیشکش کو تذکرہ کا روپ نہیں دیا بلکہ زندگی کی ایک بہت بڑی ضرورت ملازمت کے حالات کو بھی ضروری تصور کر کے فن تذکرہ کی روایت میں شامل کیا۔ چنانچہ دکنی تذکرہ نویسوں کی تحریروں میں دو ایسے تذکرے بھی شامل ہیں جن میں دوران ملازمت پیش آنے والے حالات کو تذکرہ کے روپ میں ظاہر کیا گیا ہے اس خصوص میں محمد تراب علی تذکرہ ملازمت کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

” چونکہ میرے لیے اس وقت تک کسی مستقل جائیداد کا تعین نہیں ہوا ہے اور جس کے لیے اکثر مجھے سہ کار میں یا دہی کرنی پڑتی ہے۔ اور ان حالات کے ضروری حصے کو بار بار عرض کرنا اور عرض یا دہی میں ان کا لکھنا طرالت سے خالی نہ تھا اس لیے بعض ضروری کاغذات کو جمع کر کے طبع کروائے ہیں۔“

تذکرہ کے فن کو کارنامہ ملازمت کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے محمد تراب علی نے اپنی کتاب ”تذکرہ ملازمت“ میں ملازمت کے کارناموں کے مراسلوں اور ستاسنی مراسلوں کو یکجا کر کے تذکرہ کا روپ دے دیا ہے۔ کتاب کے حصہ اول میں ملازمت کے حالات اور اس کے وثائق پیش کیے گئے ہیں۔ اور حصہ دوم میں نتائج کارگزاری اور لیاقت نامہ جات مرقومہ افسران بالا جمع کر دیئے گئے ہیں۔ حصہ اول میں ۵۳ مراسلوں کے ذریعہ خط و کتابت کا حالہ دیا گیا ہے اسی طرح حصہ دوم میں ۵۵ مراسلوں کے ذریعہ ان کی خدمات کو اپنے ہمراہنے اور آفیسروں کے ذریعہ احکامات کے اجرا کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ محمد تراب علی ایک استاد کی حیثیت سے اپنی ملازمت انجام دے رہے تھے اور انھوں نے یہ تذکرہ اپنی جزوقتی ملازمت کو ہمہ وقتی میں تبدیل کرنے کے لیے تحریر کیا۔ کتاب کے آخر میں ان کی تقرری کے لیے اسپیشل تحصیلدار کی سفارش کا ذکر ملتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ محمد تراب علی نے ملازمت کے مراسلوں کو ترتیب دے کر اسے تذکرہ کا نام دے دیا۔ درحقیقت یہ تراب علی کی ملازمت کے زمانے کا تذکرہ ہے اور انھوں نے دوران ملازمت اپنی خدمات سے ظہور میں آنے والی خدمات کو تحریری روپ دے کر اسے تذکرہ کی صنف میں شامل کر دیا جس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ دکن میں تحریر کردہ تذکرے صرف سوانحی مواد پیش کرنے کی حد تک محدود نہیں رہے بلکہ دکنی تذکرہ نویسوں نے زندگی میں درپیش تمام مسائل کے دلائل اختیار کر دے دیئے کو تذکرہ کی شکل دے دیا جس کی مثال "تذکرہ ملازمت" سے دی جاسکتی ہے جس کے وسیلے تراب علی نے ملازمت کے کارناموں کو مرتب کر کے اسے تذکرہ کا نام دیدیا ہے۔ دکن میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں کی فہرست میں اس قبیل کے کئی تذکرے ملتے ہیں جن میں اس فن کو ملازمت کے کارناموں کے لیے بھی مختص کیا گیا ہے جس کی ایک مثال تذکرہ زیبا^۱ سے دی جاسکتی ہے۔ اس تذکرہ کو سید محمد تقی اور سید شرف الدین نے ترتیب دیا۔ درحقیقت یہ تذکرہ لطیف یار جنگ کی ملازمت محکمہ آبکاری میں ان کی خدمات سے متعلق سائنسی مواد پیش کرتا ہے۔ اس تذکرہ میں وداعی اور تہیتی تقاریب کی روئداد اور تقاریر کو بطور تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ لطیف یار جنگ کی وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوشی اور سید محمد تقی کے تفریحی تہنیت میں یہ تذکرہ لکھا گیا۔ جس میں مختلف نظامائے آبکاری اور صیغہ دار اور انسپکٹرس کے احساسات اور جذبات کو جو وداعی تقاریر کے دوران پیش کئے گئے۔ تذکرے کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس تذکرہ میں تقاریر کے ساتھ ساتھ قصائد اور قطعات بھی درج ہیں جنس کی شکل میں یادگار نظمیں بھی تحریر کی گئی ہیں۔ اس طرح یہ تذکرہ ایک گلدستہ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں لطیف یار جنگ کی ملازمت اور ان کے کارناموں کو سراہتے ہوئے انہیں وداع کیا گیا اور نئے ناظم کی حیثیت سے سید محمد تقی کا استقبال کیا گیا۔ درحقیقت یہ تذکرہ وداعی و استقبالیہ تقریب کی ایک روئداد ہے۔ جس میں نثر و نظم کے ذریعہ خراج پیش کرنے کے طریقے کو ردوار لکھا گیا ہے۔ قصیدہ خانہ نظمیں اور نثری مضامین کے جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سید شرف الدین نے اپنے اس

تذکرے کو بطور کارنامہ ملازمت پیش کرتے ہوئے خراج عقیدت کے طریقہ کو اپنایا جس سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچتی ہے کہ دکن کے تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو امتیازی خصوصیت کا حامل بنانے کے لیے اس کی ہئیت میں کئی تبدیلیاں کیں جس کی وجہ سے تذکرہ دکنی دور میں ایک فعال صنف کی حیثیت کا حامل ہو گیا۔

تذکرہ بطور تاریخ ادارہ :

دکنی تذکروں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ دکن میں لکھے گئے تذکرے صرف سوانحی مواد کی حد تک محدود نہیں رہے بلکہ دکن کے تذکرہ نویسوں نے ادارہ جات کی تاریخ لکھنے کے لیے بھی تذکرے کے فن کو بروئے کار لایا ہے۔ درہ قدیم سے ہی یہ روایت چلی آرہی تھی کہ کسی کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں مواد پیش کرنے کو تذکرے کا نام دیا جائے۔ دکنی تذکرہ نویسوں نے نہ صرف اس قدیم انداز کی روایت شکیں کی بلکہ تذکرہ کو فنی طور پر متعدد قسم کے اظہارات سے بھی وابستہ کر دیا جس کی ایک بہترین مثال دکن میں تحریر کردہ تذکروں میں ادارہ جات کی تاریخ کو یکجا کرنے سے دی جاسکتی ہے۔ دکن میں لکھے گئے تذکروں میں تذکرہ دارالعلوم اور تذکرہ شعبہ قانون یہ ایسے تذکرے ہیں جن میں ادارے اور شعبہ جات کی تاریخ کو منضبط کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔

”تذکرہ دارالعلوم“ نصیر الدین ہاشمی کا تحریر کردہ تذکرہ ہے جس میں انھوں نے حیدرآباد کے مشہور مدرسہ دارالعلوم کی ابتدا سے تاریخ درجے کی ہے۔ حیدرآباد میں تسلیم کی شروعات کے اعتبار سے دارالعلوم سب سے پہلے مدرسہ

معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ مدرسہ دارالعلوم کی ابتدا، محرکات، طرز تعلیم، اساتذہ
 ظہار اور اس عہد کی تعلیمی مشغولیات کے بارے میں تفصیلات بھی پیش کرتا ہے۔ ریاست
 حیدرآباد میں انصافی اور تعلیمی تحریکات کے ابتدائی دور میں اس مدرسہ کا قیام عمل میں آیا
 یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں اس مدرسہ کو اولیت حاصل ہے نصیر الدین
 ہاشمی نے "تذکرہ دارالعلوم" لکھ کر نہ صرف اس مدرسہ میں درس و تدریس کے طریقہ
 کے بارے میں تفصیلات تحریر کی ہیں بلکہ اس تذکرے کے ذریعہ کی تاریخ تحریر کرنے
 کی روایت کو بھی فروغ دیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کے اس تذکرے سے وقتی تذکروں میں اس
 فن کو بطور تاریخ ادارہ تحریر کرنے کی کوشش کا پتہ چلتا ہے۔

دکن میں تذکرے کے فن کو متعدد معجم کے لیے استعمال کیا گیا تذکرہ
 نویسوں نے کسی ادارہ۔ اسوسی ایشن، تنظیم اور انجمن کی تاریخ کو مبسوط کتبائی شکل
 دے کر اسے بھی تذکرے کے نام سے معنون کیا۔ جس کی ابتدائی مثال نصیر الدین ہاشمی
 کی کتاب "تذکرہ دارالعلوم" سے دی گئی۔ دکن میں تحریر کردہ اسی قبیل کا ایک اور
 تذکرہ دستیاب ہوا ہے جسے عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ قانون نے ترتیب دیا اور تذکرہ
 شعبہ قانون" لے کے نام سے جامعہ عثمانیہ سے ملحقہ شعبہ قانون کی تاریخ کو تحقیقی انداز میں
 پیش کیا ہے۔ یزم قانون جامعہ عثمانیہ کی کھانب سے مرتب کردہ اس کتاب میں تاریخی
 استدلال واضح ہے۔ اس کے علاوہ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ یونیورسٹی میں قانون
 کے شعبہ کے قیام اور اس شعبہ کے تحت تعلیم کے آغاز کے ساتھ ساتھ مختلف عہدوں
 میں ڈگری یافتگان اور نامور وکلاء کے بارے میں تفصیل درج کی جائے۔ درحقیقت
 اس تذکرے سے مختلف سنین میں قانون کی ڈگری لینے والوں کی تفصیل اور ان کی عوام میں

مقبول پریکٹس کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ بزم قانون نے ان ہونہار وکلاء کی تعلیمی زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے جو سند یافتگی کے بعد ریاست حیدرآباد اور ملک کے نامور ناہر قانون اور منصف قرار دیئے گئے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد سے شعبہ قانون کی ترقی اور اس شعبہ سے وابستہ اساتذہ اور طلباء کے کارنامے اور ان کی مصروفیات کو درج کرتے ہوئے اس تذکرے میں حیدرآباد کے ڈکٹری یافتہ قانون کے زمانہ طالب علمی کے حالات درج کیے گئے ہیں۔ درحقیقت یہ تذکرہ ایک رپورٹ کی شکل رکھتا ہے۔ جس میں ہر سنہ میں سند یافتہ طلباء کی تفصیل ان کی کامیابی کے درجہ کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے۔ یہی تذکرہ کو تاریخ ادارہ کے صیغہ میں اس لیے شمار کیا جاتا ہے کہ توسط سے شعبہ قانون کی تفصیلات کا علم ہوتا ہے۔

تذکرہ بطور ذخیرہ معلومات :

دکن میں تحریر کردہ تذکروں کے جائزے اندازہ ہوتا ہے کہ سرزمین کے تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو ایک فعال صنف کے درجہ دینے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ رہا کہ دکن میں تحریر کردہ تمام تذکرے متعدد فنون اور اندازہ و اظہار کے نمائندہ ہو گئے ابتدائی طور پر چند تذکرے دکنی زبان میں لکھے گئے۔ لیکن رفتہ رفتہ دکنی زبان اور لہجہ میں فرق پیدا ہوا اور تذکرے عام ادبی زبان میں لکھے جانے لگے۔ دکن کے تذکرہ نویسوں کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انہوں نے اس فن کو سیما صفت حیثیت دینے کی کوشش کی اور تذکرے کو طرح طرح کے انداز سے وابستہ کر دیا چنانچہ دکن میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے تذکرے کو خیرہ معلومات کی حیثیت دے دی۔ اس خصوصیت کے حامل تذکروں کی فہرست میں محمود محمدانی

کی کتاب "تذکرہ طاعون" کو ادبی طور پر بیماری کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والی دینی تصنیف کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

محمود صمدانی نے "تذکرہ طاعون" سلسلہ میں مختلف طبی معلومات کے ذریعہ مرض طاعون کی ابتداء اس کے تدارک کے لیے انتظامات اور مرض سے نجات کے بارے میں تفصیلات درج کی ہیں۔ اس تذکرے کو طبی کتاب کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ تذکرہ نے بنیادی طور پر اس کتاب کو ہندوستانی ماحول میں لکھا اور کسی قدر مرض طاعون کے بارے میں معلومات فراہم کر کے انہیں کتابی شکل دے دی۔ اس کتاب میں مرض طاعون کے بارے میں چیدہ چیدہ معلومات کو جزوی طور پر تحریر کیا گیا ہے۔ مواد کے اعتبار سے کتاب کو تذکرے کی سرشت میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس تذکرے میں شخصی تذکرے کا عکس نہیں ملتا اور نہ ہی مرض طاعون کی تاریخ میں اس تذکرے میں پیش کی گئی ہے بلکہ مرض کی شروعات اور اس کی روک تھام کے بارے میں معلومات اکٹھا کی گئی ہیں۔ اس لیے اس کی حیثیت کسی قدر معلوماتی کتاب کی ہو جاتی ہے مرض طاعون کے بارے میں اس تذکرہ سے مکمل متن دستیاب نہیں ہوتا چونکہ تذکرے کی خصوصیت ہوتی ہے کہ اس صنف میں صاحب شخصیت کے بارے میں چند اہم معلومات کو اکٹھا کر دیا جاتا ہے اور اس فن میں تحقیقاتی متن نہیں ہوتا اور یہی انداز تذکرہ طاعون میں اختیار کیا گیا ہے۔ چند معلومات کو اکٹھا کر کے طاعون کے بارے میں اہم مواد فراہم کر دیا گیا ہے اس لیے اس تذکرہ کو فنی اعتبار سے معلومات فراہم کرنے والے تذکرے کا درجہ دیا جاتا ہے۔

دینی تذکروں میں یہ امتیازی خصوصیت پائی جاتی ہے کہ شمالی ہند کے مقابلہ میں یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے اس فن کو جامع ترین ہیئت کے طور پر استعمال کیا اور تذکرے کی معنویت کو اس حد تک ہمہ گیر بنا دیا کہ اس کی حیثیت ایک سیال صنفِ سخن کی ہو گئی۔

تذکرہ بطور تاریخ عمارت :

عمارتوں کی تاریخ لکھنے کی روایت کو بطور تذکرہ پیش کرنے کا انداز بھی دکن میں فروغ پاتا رہا۔ دکنی تذکرہ نویسوں نے فن تذکرے کو صرف شخصیات اور سیرت کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس فن کو وسعت دیتے ہوئے عمارتوں کی تاریخ تحریر کرنے کے لیے بھی استعمال کیا اس خصوص میں تحقیق کے دوران سالار جنگ میوزیم لائبریری کے قلمی کتب خانہ میں ایک مخطوطہ دستیاب ہوا ہے جو تاریخ کے شعبہ میں ۵۱۱ نمبر پر محفوظ ہے "آثار الادنان" کے زیر عنوان سید محمد علی الدین خاں نے ایسی تاریخی عمارتوں کی تفصیل پیش کی جو مذہبی طور پر اہمیت کی حامل ہے۔ چنانچہ اس کتاب کو انھوں نے معابد مقدسہ اہل ہند کا نام بھی دیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ان تمام صورتوں کا تذکرہ کیا ہے جو پہاڑوں میں پتھر کو تراش کر بنائی گئی ہیں۔ درحقیقت یہ قلمی کتاب بت پرستی پر اعتقاد رکھنے والے افراد کے لیے یہ معلومات فراہم کرتی ہے کہ پہاڑوں پر کس طرح صناعتی کے ساتھ عمارتی تعمیر کی گئیں اور ان میں دیوی اور دیوتاؤں کے بت بنائے گئے۔ سید محمد علی الدین خاں نے "آثار الادنان" میں ابتدائی طور پر کوہستانی دیولوں کے بانیوں کا ذکر کرتے ہوئے ہر فرقہ کے مندروں کی علامات اور ان کی تعداد کے بارے میں تفصیلات درج کی ہیں درحقیقت مندر کا شمار ایک مذہبی عمارت کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ اسی لیے اس کتاب کو تاریخ عمارت کے صیغہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

"تذکرہ آثار الادنان" مندروں کی عمارت اور دیوی اور دیوتاؤں کے حالات کی نمائندگی کرتا ہے مصنف نے پچھتر صورتوں کے نام اور ان کے حالات قلمبند کرنے کے

بعد اورنگ آباد کے پہاڑی مندروں کی عمارتوں اور ایلورہ اور ایجنٹہ کے غاروں میں
 تماشیدہ مورتیوں کی تفصیل پیش کی ہے۔ ابتدائی طور پر کتاب کا آغاز مقدمہ سے کیا گیا
 ہے۔ پوری کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں پہاڑیوں پر آباد مندروں کی عمارت
 اور بتوں کے بارے میں مختصر سی تفصیل درج کی گئی ہے ایلورہ کے تمام ۱۶ غاروں کا تذکرہ
 موجود ہے جس کے ساتھ ہی اجنتا کے ۲۹ غاروں کے بارے میں تفصیلات درج کرتے
 ہوئے بیٹ، مومن آباد، کرسم، مدراس، بجواڑہ، مہاولی پور، بریار، راجگڑھ، سپتا
 مرہی، انسنہ، ناسک، کلک، کاٹھیا دار اور راجپوتانہ کے مختلف غاروں اور دیولوں کی
 عمارتوں کے بارے میں اس تذکرے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اردو ادب میں غالباً
 یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں عمارتوں کی تاریخ کو درج کرنے کے لیے مندروں کا انتخاب کیا گیا
 ہے۔ مصنف نے ”در عجائبات جہان ہندوستان“ کے زیر عنوان تشریح کر دی ہے
 کہ در حقیقت ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں جو عجیب و غریب مندروں کی عمارتیں
 تعمیر کی گئی ہیں وہ اپنے دور کی یادگار ہیں۔ اگرچہ اس کتاب میں تاریخی عنصر شامل
 ہے۔ لیکن اس قلمی نسخے کو تاریخ میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ سید محی الدین نے
 اس کتاب میں تاریخی شواہد اور ٹھوس ثبوت سے کام نہیں لیا بلکہ جس طرح اردو
 تذکروں میں عامیانہ انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس کتاب میں پہاڑوں پر
 تعمیر شدہ مندروں کا تذکرہ کیا ہے۔ سید محی الدین خاں اورنگ آباد عدالت کے
 ناظم صدر کے عہدے پر فائز تھے اس کتاب کی تحریر کا منشا یہی ظاہر ہوتا ہے کہ
 وہ اپنی تحریر کے ذریعہ اردو داں طبقہ تک پہاڑیوں پر آباد مندروں کی عمارت اور
 ان میں موجود مورتیوں کے بارے میں معلومات پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب قلمی نسخے
 کی حالت میں خوشخط نستعلیق طرز تحریر کا بہترین نمونہ ہے جو سلاطین و ملوک کی تصنیف کی
 گئی اور اسی دور میں کتابت بھی کی گئی ”آثار الالوثان“ مجموعی اعتبار سے دیولوں کی

عمارتوں کا ایک بہترین تذکرہ ہے جس میں کسی قدر تاریخی عکس بھی شامل ہے چونکہ دیول یا منٹ رو کا شمار بھی ایک عمارت میں کیا جاتا ہے اور ایلورہ اور اجنٹا کے غاروں کی تراش کا مقصد بھی مورتیوں میں ایستادہ کرنا تھا اسی لیے اس کتاب کو تاریخ عمارت کا درجہ دیا جائے گا اور اس کتاب میں محفوظ متن تذکرے کے انداز کو پیش کرتا ہے۔ اسی لیے "آثار لا دثان" کو دکن میں تحریر کردہ تذکرے کی حیثیت دی جاتی ہے۔

تذکرہ بطور شجرہ :

دکن میں تحریر کردہ تذکروں کی یہ ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں کے ادیبوں نے فن کو ہمیشہ جیتا جاگتا رکھنے کے لیے جدید تقاضوں سے منسلک رکھا جس کی مثال دکنی تذکروں سے دی جاسکتی ہے۔ عموماً کوئی صنف ادب جب جدید تقاضوں کی پابجائی سے غیر محرم ہو جاتی ہے تو لازمی طور پر ادب میں اس کا شمار کلاسیکی طرز میں کر دیا جاتا ہے۔ دکنی تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہوتی ہے کہ دکن کے ادیبوں نے اس صنف کو جدید ادب سے وابستہ کرنے کیلئے نئے نئے بحرے کیے اور اسے ہر آہنگ سے وابستہ رکھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ قدیم دور میں تذکرے کا مفہوم جو کلاسیکی طرز سے وابستہ تھا اس روایت کو توڑتے کا حق دکنی تذکرہ نویسوں نے انجام دیا اور فن تذکرہ کو ایک متحرک صنف ادب قرار دینے کی کوشش کی جس کی بہترین مثال تذکرہ کو بطور شجرہ استعمال کرنے سے دی جاسکتی ہے۔ کئی کتابیں مطبوعہ حالت میں دیکھی گئی جن میں تذکرہ کی روایت کو شجرہ کے طور پر پیش کرنے کا ثبوت ملتا ہے لیکن یہاں پر صرف مخطوطات سے بحث کی جاتی ہے۔ مطبوعہ تذکرے کی فہرست میں "تذکرۃ قادریہ ملہ اور تذکرہ اولیاء

ملہ تذکرہ قادریہ از محمد عبدالقادر مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۸۶ھ

ابوالعلائیہؒ میں تذکرے کو بطور شجرہ پیش کرنے کا مواد ملتا ہے۔ اسی طرح قلمی نسخوں میں شجرۃ المحمودؒ اور شجرۃ الانسابؒ اور سلسلہ مشائخ طریقتؒ بھی تذکرے کو بطور شجرہ استعمال کرنے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

شجرۃ المحمودؒ محمد منیر الدین چشتی محمودی کا تحریر کردہ مخطوطہ ہے جو اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ فہرست میں اسے مجامع ۴۷۵ کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس کی بن تالیف ۱۳۰۳ھ درج کی گئی ہے۔ درحقیقت یہ تذکرہ سلسلہ چشتیہ کے بزرگان دین کے حالات اور کرامات کے علاوہ ان کے شجرہ کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ سلسلہ چشتیہ سے وابستہ ۱۹۵ بزرگان دین کے سلسلے کو ظاہر کرتے ہوئے محمد منیر الدین نے اس تصنیف کا آغاز حضرت علیؑ سے کیا ہے اور اختتام اپنے مرشد شیخ محمود میاں کے والد کے حالات درج کر کے شجرہ کی تفصیل بھی پیش کی ہے۔ محمد منیر الدین حیدر آباد کے متوطن صوفی اور شاعر تھے منیر تخلص اور شیخ محمود میاں گجراتی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے تذکرے کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے جدت سے کام لیا ہے اور شجرہ نویسی کو تذکرہ کے فن میں شامل کر دیا ہے۔ اس مخطوطہ کی خصوصیت یہی ہے کہ اس کی وجہ سے دکن میں تحریر کردہ تذکروں میں اس مخطوطہ کو اہمیت کے ساتھ شامل کیا جاتا ہے۔ تذکرے کی صنف میں حسب نسب کو بطور تذکرہ پیش کرنے والے مصنف

۱۔ تذکرۃ الاولیاء ابوالعلائیہؒ۔ از میر کاظم علی خاں مطبوعہ حیدر آباد ۱۳۷۲ھ

۲۔ شجرۃ المحمود (قلمی) از محمد منیر الدین چشتی محمودی۔ تصنیف ۱۳۰۳ھ

۳۔ شجرۃ الانساب از۔ گردھاری پرشاد باقی (قلمی)

۴۔ سلسلہ مشائخ طریقت۔ از محمد علی درویش (قلمی)

گردھاری پرشاد باقی ہیں جن کا تذکرہ "شجرۃ الانساب" دکنی تذکروں میں ایک اہم مخطوطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تذکرہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں ۳۰۷۷ء تذکرے میں درج ہے۔ گردھاری پرشاد حیدر آباد کے متوطن تھے اور ان کا تخلص باقی تھا۔ گردھاری پرشاد کے اس مخطوطہ میں "علم الانساب" کا انداز غالب ہے۔ لیکن یہ مخطوطہ تذکرے کے ضمن میں شامل کیا جاتا ہے۔ گردھاری پرشاد نے اس تذکرے کو شجرہ کی تفصیل کی طرح نسب کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی اس تصنیف میں کسی قدر تاریخی استدلال کے ذریعہ بتایا ہے کہ علم الانساب کی تاریخ کسب سے شروع ہوئی اور نسب ہانچنے کا طریقہ اقوام میں کب سے رائج ہوا۔ اگرچہ اس تصنیف میں تاریخی استدلال موجود ہے لیکن اس کا شمار تذکرے میں کیا جاتا ہے۔ متن اور مواد کی ترتیب میں تذکرے کا فن جن بے اعتدالیوں سے وابستہ رہتا ہے وہ عکس علم الانساب میں پوری طرح اُجاگر ہے۔ اسی لیے اس تصنیف کو تذکرے کا درجہ دیا گیا ہے۔ دکنی تذکروں میں ایک منفرد فنی خصوصیت اور ہیبتی اعتبار سے علیحدہ طرز کی نمائندگی گردھاری پرشاد کے اس تذکرے میں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

دکنی مخطوطات کی فہرست میں فدا علی درویش کا ایک ایسا قلمی نسخہ بھی درج ہے جو اسے جو تذکرے کو شجرہ کے طور پر استعمال کرنے کی دلیل پیش کرتا ہے۔ "سلسلہ مشائخ طریقت" ایک ایسا مخطوطہ ہے جس میں فدا علی درویش نے مختلف مشائخ طقت کے سلسلہ طریقت کے تذکرے کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ اس قلمی نسخہ کا شمار تذکرے میں ہوتا ہے لیکن شجرہ پیش کرنے کی خصوصیات اس تصنیف میں موجود ہیں۔ یہ تذکرہ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں قلمی (۲۷۰) پر درج ہے۔ فدا علی درویش حیدر آباد کے متوطن تھے جس میں تفصیلی طور پر مختلف مشائخ طقت کے سلسلہ طریقت کو پیش کیا گیا۔ چونکہ یہ تذکرہ دکن میں تحریر کیا گیا اسی لیے اس کا شمار دکنی تذکروں میں پیش کیا جاتا ہے۔ پیر، پیر خیمہ اور

اولیائے کرام کے علاوہ مشائخین سے اکتساب فیض اور بیعت کے طریقے سے متعلق حالات اور واقعات کو بطور تذکرہ پیش کرنے کی جدت سب سے پہلے فدا علی درویش نے کی اس تذکرے کے ذریعہ مشائخین کے خالق ایسی نظام اور بیعت کرنے کی تاریخ کو تذکرہ کے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے دکنی تذکروں میں اس تصنیف کی حیثیت ایک منفرد تذکرہ کی ہو جاتی ہے جو شجرہ کے ساتھ ساتھ بیعت کی تاریخ بھی پیش کرتا ہے۔ جس سے ثبوت ملتا ہے کہ دکنی تذکرے متعدد طرز اسلوب سے وابستہ رہے۔

تذکرہ بطور خطبہ و خطابات :

عام طور پر خطبات سے مراد ذی حیثیت افراد کے وہ الفاظ ہیں جو معنوی حیثیت سے جامع ہونے کے علاوہ اپنے اندر کشش بھی رکھتے ہیں۔ امیر دمرار، بادشاہ و سلاطین اور پیر طریقت کی جانب سے عطا کردہ وہ علمی کام جو صاحب شخصیت کی خصوصیت اور اس کی فطرت کی غمازی کرے وہ خطبات کہلاتا ہے جو نہ صرف انسان کی شخصیت کو قدامت بنا تا ہے بلکہ اچھی خطبات کی وجہ سے انسان کو سماج میں بلند مقام بھی ملتا ہے۔ خطبات کی حیثیت صرف صوری نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذریعہ خطبہ دینے والوں کی زبان اندانی کا پتہ چلتا ہے۔ چونکہ جنوبی ہند میں بھی مختلف علماء و صوفیا موجود تھے۔ اس لیے دکن میں خطبات کو فروغ دینے کا سلسلہ جاری رہا۔ جس کے نتیجے میں تذکرہ کو بطور خطبات رواج دینے کا سلسلہ شروع ہوا دکنی تذکرہ نویسوں نے خطبوں کی تاریخ مرتب کرنے کا ایک نیا طریقہ اپنایا۔ اس کے ذریعہ نہ صرف خطبات کی تاریخ مدون کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ علماء اور فضلاء نے مختلف مذہبی جلسوں سے خطاب کرتے ہوئے جو خطبے دیئے ان کی بھی تفصیل پیش کی گئی۔ دکنی تذکروں کے مخطوطات کی طویل فہرست میں ”تذکرہ خطابات“ اور ”کشل“ ایسی تصانیف ہیں جس میں خطبات کی تفصیل درج ہے۔

”تذکرۃ الخطایہ“ دکنی تذکروں میں اہمیت کا حامل تذکرہ ہے جسے محمد عثمان

عمادی نے لکھا ہے اس تذکرے کے ذریعہ پیغمبر اسلام، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان غنی، حضرت عید اللہ بن زبیر، حضرت علی، حضرت طارق بن زیاد حضرت عمر بن عبد العزیز اور شیخ عبد القادر عمادی کے خطبوں کو تالیف کی شکل میں پیش کیا گیا ہے درحقیقت اس تذکرہ کو خطبوں کے تذکروں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ محمد عثمان عمادی نے اس تذکرے میں اسلام کے نامور اشخاص کے خطبات کو یکجا کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ درحقیقت حریت کی روح خطبات کے ذریعہ مسلمانوں میں پھیلتی گئی۔ دکنی تذکروں میں اس تالیف کی حیثیت منفرد سمجھی جاتی ہے اور اس امر کی بھی وضاحت یہی ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں کی جدت طبع نے اس فن کو مختلف حیثیات سے فروغ دینے کی کوشش کی ہے، محمد عثمان عمادی کا یہ تذکرہ دکنی تذکروں میں اس وجہ سے علیحدہ مقام رکھتا ہے کہ اس کے ذریعہ مؤلف نے تذکرہ کی روایت میں جدت کی بنیاد قائم کی اور فن کو شخصی تذکرہ سے علیحدہ کر کے خطبات کے تذکرہ سے مربوط کر دیا۔

دکنی تذکروں کی فہرست میں ”کشکول“ بھی اپنی علیحدہ حیثیت رکھتا ہے۔ فرید الدین خاں خویشگی نے اس تذکرہ میں ابتدائی طور پر وجود انسان اور سترۃ علوم سے بحث کرتے ہوئے پانچ ابواب کے بعد مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو خطابات سے نوازا ہے۔ چنانچہ وہ بزرگوں اور حکمائے متقدمین کی درجہ بندی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

۱۔ فرقہ اول : حکمائے متصوفین { نبوت و رسالت کے قائل۔ طابع احکام۔
۲۔ فرقہ دوم : حکمائے متکلمین

۱۔ تذکرۃ الخطایہ۔ مطبوعہ۔ از محمد عثمان عمادی ۱۹۳۵ء

۲۔ کشکول۔ مخطوطہ سالار جنگ میوزیم لائبریری از فرید الدین خاں خویشگی۔

۳۔ فرقہ سوم :- علمائے اشرافین { تابع عقل اور نیچر پرست
۴۔ فرقہ چہارم :- حکمائے مشائین

اس تذکرہ کے ذریعہ فرید الدین خاں خویشگی نے مفکین کے درجے متعین کر کے انہیں مختلف خطابات سے نوازا ہے۔ اور مذہبی احکام کی پابجائی اور مذہبیت کے قائل علماء کو متصوفین اور متکلمین کے خطابوں سے نوازا۔ جبکہ خدا اور رسول کے وجود سے انکار کرنے والے علماء کو اشرافین اور مشائین کے خطابات دیئے اس طرح فرید الدین خاں خویشگی کا یہ تذکرہ مذہبی اور غیر مذہبی حکمائے عالم کو چار مختلف خطابوں سے معنون کرتا ہے۔ اسی لیے دکنی تذکروں میں کثکول کو خطابات کے تذکرے کی حیثیت دی جاتی ہے اگرچہ اس تذکرہ میں بادشاہوں کی جانب سے عطا کردہ خطابات کا ذکر نہیں ہے لیکن حکمائے عالم کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی لیے یہ تذکرہ خطابات کے صیغہ میں شمار کیا جائے گا۔

تذکرہ بطور سیرت:

سوانح اور سیرت میں تھوڑا سا فرق پایا جاتا ہے۔ عام طور پر زندگی کے حالات تحریر کرنے کو سوانح کا درجہ حاصل ہے۔ سیرت سوانح سے اعلیٰ معیار کی متقاضی ہوتی ہے۔ عموماً سیرت نگاری کے دوران شخصیت سے زیادہ کارناموں کی تفصیل پر توجہ دی جاتی ہے جس کے نتیجے میں سیرت نگاری کے دوران شخصیت سے زیادہ کارناموں کی تفصیل پر توجہ دی جاتی ہے جس کے نتیجے میں سیرت نگاری شخصی واقعات کا بلند نہ نہیں بنتی بلکہ کارناموں کے بیان کا بہترین ذریعہ بن جاتی ہے۔ سیرت نگاری کے دوران سوانحی عکس کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ لیکن سیرت کی خصوصیت یہی ہے کہ اس کے توسط سے انسان کے روحانی ارتقاء اور اس کے خصائل سے بحث کی جاتی ہے۔

جبکہ سوانح نگاری میں صرف شخصیت اور کارناموں کی تاریخ درج ہوتی ہے اس اعتبار سے سیرت نگاری نہ صرف انسان کے باطنی اطوار کی تصویر کشی کرتی ہے بلکہ روحانی طاقتوں سے دل کو مسحور کرنے کی صلاحیت کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتی ہے۔ دکنی تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کو سیرت کے طور پر بھی استعمال کیا۔ سوانح تحریر کرنے کا تصور عام طور پر دکن میں تذکرے سے وابستہ رہا۔ جس کے ساتھ ہی مذہبی علماء کی سیرت کو بطور تذکرہ پیش کرنے کی روایت بھی عام ہو گئی۔ دکنی خطوط میں کئی ایسی تصانیف دیکھنے میں آئی ہیں جن کا مقصد علوم باطنی سے آستا مذہبی علماء کی سیرت تحریر کرتا رہا۔ مطبوعہ کتابوں میں "تذکرہ تاج الاولیاء" لے اس کے علاوہ "تذکرہ حسن" لے "تذکرہ حسین" لے "تذکرہ حضرت جلال الدین" لے "تذکرہ حمید الدین ناگوری" لے "تذکرہ خواجہ عبداللہ خاں" لے "تذکرہ سادات" لے "تذکرہ سید" لے

لے تذکرہ تاج الاولیاء۔ از محمد حسام الدین مطبوعہ حیدرآباد۔

لے۔ تذکرہ حسن از محمد حسام الدین فاضل مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۵۳ھ

لے تذکرہ حسین از

لے تذکرہ حضرت جلال الدین از سناوت مرزا مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۶۲ء

لے تذکرہ حمید الدین ناگوری۔ از ریاضت علی چشتی مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۶۶ء

لے تذکرہ خواجہ عبداللہ خاں۔ از سید محمد اکرام الدین خاں۔ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۶۲ھ

لے تذکرہ سادات۔ از ناصر الدین علی قادری۔ مطبوعہ حیدرآباد دکن

لے تذکرہ سید از محمد افضل اقبال مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۷۳ء

تذکرہ علیؑ، تذکرہ غوث دکنؒ، تذکرہ مخدوم زادہؒ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے سیرت نگاری میں مکمل کامیابی حاصل کی۔

دکن کے تذکرہ نویس غریبوں پر علماء اور مشائخین سے گہری وابستگی رکھتے تھے جس کے نتیجے میں تذکرہ کی مکمل روایت سیرت نگاری سے معمور ہو گئی۔ تذکرہ حسین اور تذکرہ علی جیسے دکنی تذکروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں دکنی تذکرہ نویسوں نے مختلف عالموں اور اولیائے کرام کی خدمات کو سیرت کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ان کی تصانیف تذکرہ کے روایت کی حامل ہو گئیں اور اولیائے کرام اور علماء کی مبسوط سوانح لکھنے کو لیے تذکرہ کی ذیل میں شامل کیا جاتا ہے کہ جس طرح دورِ قدیم میں اردو شاعروں کے بارے میں تذکرہ تحریر کرتے ہوئے تذکرہ نویس مختصر سوانح بیان کرنے کو ضروری خیال کرتے تھے اور پھر ان کا کلام درج کیا جاتا تھا۔ اسی طرح دکن کی مذہبی تصانیف میں بھی ابتداء میں اولیائے کرام یا علماء کی مختصر سوانح درج کی جاتی ہے اور پھر ان کے روحانی کمالات کا ذکر کیا جاتا ہے اسی لیے ان تصانیف کو تذکرہ کی سرشت میں شامل کرتے ہوئے انہیں سیرت کا درجہ دیا جاتا ہے کیونکہ ان کتابوں میں روحانیت اور اخلاقی کردار کو نمایاں طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اخلاقیات اور روحانیت کو جس سوانح میں شامل کیا جاتا ہے وہ حقیقی طور پر سیرت نگاری کی کتابوں میں شامل کی جاتی ہیں۔ دکنی کے اکثر تذکروں میں مذہبی رنگ کے ساتھ ساتھ روحانیت کا عکس بھی شامل ہے۔

۱۔ تذکرہ علی از: محمد حسام الدین فاضل حیدر آباد دکن ۱۳۵۶ھ

۲۔ تذکرہ غوث دکن از محمد تاج الدین۔ مطبوعہ حیدر آباد دکن

۳۔ تذکرہ مخدوم زادہ از عظمت اللہ حسینی زیدی۔ مطبوعہ حیدر آباد دکن

ہے۔ اس انداز کے تذکروں میں دکنی ادبیات کا یہ طویل سلسلہ ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ کو بطور سیرت پیش کرنے کا ذوق دکن میں کافی حد تک پروان چڑھ چکا تھا۔

تذکرہ بطور شخصی سوانح :

شخصی کارناموں کو پیش کرتے ہوئے صاحب شخصیت کے کردار کا بھلائے کے لیے لکھے جانے والے تذکرے شخصی سوانح کی ضمن میں آتے ہیں۔ عام طور پر اس قسم کے تذکروں میں مذہبی یا ادبی شخصیت کو زیر بحث نہیں لایا جاتا بلکہ اپنے کردار اور عمل سے متاثر کرنے والے افراد کے تذکرہ کو شخصی سوانح کی تعریف میں شامل کیا جاتا ہے۔ شخصی سوانح اگرچہ کہ مذہبی اور ادبی حیثیات سے اہمیت رکھنے والے افراد سے متعلق نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس طریقہ تذکرہ میں کارناموں کی اہمیت کے اعتبار سے شخصیت کو ابھارا جاتا ہے۔ یعنی شخصی سوانح کا تعلق علم تاریخ سے نہیں ہوتا بلکہ فلاحی، تعلیمی، طبی اور ثقافتی خدمات انجام دینے والے افراد کے کارناموں کو ضبط تحریر میں لانا شخصی سوانح کی ذیل میں شامل ہے۔ دکن میں ایسے متعدد تذکرے تحریر کیے گئے جن میں شخصی سوانح کا عکس غالب ہے۔

تذکرے کی خصوصیت میں شخصیت کے اظہار کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے جبکہ سوانح صرف ایک ہی شخصیت کے کارناموں کے اظہار پر مبنی ہوتی ہے۔ دکن میں تحریر کردہ بعض تذکروں کو شخصی سوانح کے طور پر اس لیے قبول کیا جاسکتا ہے کہ اگرچہ ان تذکروں میں شخصیت کا عکس غالب ہے لیکن تذکرہ نویسوں نے سوانحی اعتبار سے شخصیت کے کارناموں کو نمایاں حیثیت دی ہے۔ اس قسم کے تذکروں میں سیاسی، مذہبی اور سماجی شخصیات کو شامل نہیں کیا گیا بلکہ ایسے افراد کی سوانح کو ہی اس ضمن میں شمار کیا گیا ہے جو اپنی تعلیمی، فلاحی اور ثقافتی خدمات کی وجہ سے مشہور تھے۔ اس قسم کے

تذکرے چونکہ شخصی خدمات کے بارے میں مواد فراہم کرتے ہیں اسی لیے ان کا شمار تذکرہ کی ایک شکل شخصی سوانح میں کیا جاتا ہے۔ دکن میں اس قسم کے تذکروں کا طویل سلسلہ ہے۔

دکنی نثر دور قدیم سے عہد حاضر تک تذکرے کے فن کو اپنائے ہوئے ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آج کے دور میں بھی کسی اہم شخصیت کی سوانح لکھنے کے بعد مصنف کتاب کے عنوان کو تذکرہ کی سرخی سے نوازنے کو فخر کا درجہ محسوس کرتا ہے۔ دکنی تذکرہ نویسوں نے سوانح کے بیان کے دوران تذکرہ کی روایتی صنف کو برقرار رکھے ہوئے شخصی سوانح پیش کرنے میں دکنی تذکرہ نگاروں کا اسلوب اور انداز بیانات خود منفرد نہیں ہے۔ لیکن اس طرز میں سوانحی نقوش واضح ہوتے ہیں۔ دکن میں جن شخصیات کے تذکرے لکھے گئے انہیں تذکرہ بطور شخصی سوانح کا نام اس لیے دیا جاتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے ان تذکروں میں اسی فنی روایت کو برقرار رکھا ہے جو قدیم تذکروں میں مروج رہی۔ ادبی تذکروں میں کئی شعراء یا ادیبوں کے حالات بیان کیے جاتے تھے۔ دکن کے تذکرہ نویسوں نے اسی طرز کو اپناتے ہوئے مختلف علوم و فنون میں ماہر افراد کے تذکرے تحریر کیے جو ادبی اور مذہبی تذکروں سے بالکل مختلف ہیں۔ ایسے تذکروں فہرست میں مخطوطات بھی شامل ہیں اور مطبوعات کا طویل سلسلہ بھی ہے۔

شخصی سوانح کو بطور تذکرہ پیش کرنے کی روایت دکن میں مرزا محمد علی کے مخطوطہ ”تذکرہ خوشنویساں“ سے ہوتی ہے۔ یہ تذکرہ سالار جنگ میوزیم لاٹیرری کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ ۳۲۳ء میں تحریر کردہ یہ تذکرہ درحقیقت حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر دور جدید کے مشہور کتبہ نویس اور خوش نویسوں کے بارے میں مختصر سوانحی مواد پیش کرتا ہے۔ مرزا محمد علی نے خط کی قسमें بیان کرتے ہوئے ان کے موجدین کی مختصر تاریخ بھی تحریر کر دی ہے۔ ۴۲ صفحات پر مشتمل اس مخطوطہ میں کئی سو

خوش نویسیوں کے بارے میں مختصر مواد فراہم کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ عرب - ایران اور ہندوستان میں رسم الخط کی روایت مختلف ذرائع سے ترقی پاتی رہی۔ اس تصنیف میں مرزا محمد علی نے ان کے عہد میں موجود حیدرآدی خوشنویسوں کے بارے میں بھی مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو شخصی سوانح کا درجہ اس لیے دیا جاسکتا ہے کہ ادبی اور مذہبی شخصیتوں کے علاوہ فنی دستگاہ رکھنے والے افراد کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب میں تذکرے کی روایت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ مرزا محمد علی حیدرآباد کے مشہور خطاط اور خوش نویس تھے۔ ان کا یہ مخطوطہ ثابت کرتا ہے کہ دکن میں تذکرے کی روایت کو صرف ادبی اور مذہبی شخصیات کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی حد تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ تذکرہ نویسوں نے تذکرہ کو شخصی سوانح کے طور پر بھی استعمال کیا۔ تذکرہ کو شخصی سوانح کے طور پر استعمال کرنے کا رواج دکن میں پروان چڑھتا رہا اور کئی اہم شخصیات کی سوانح کو تذکرہ کی روایت پر تحریر کر کے اسے ایک مبسوط کتابی شکل دینے کا طریقہ دکنی تذکرہ نویسوں کے فنی مزاج کی نمائندگی کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ دکن میں تذکرے کی روایت شخصی سوانح کے طور پر بھی ترقی پاتی رہی۔

تذکرہ بطور ادبی سوانح :

دورِ قدیم میں تذکرہ کی روایت قدیم اصولوں پر ترقی پاتی رہی۔ تحقیقی استدلال کی ترقی نے تذکرہ کی روایت میں تبدیلی پیدا کی اور متن کی فراہمی میں کسی قدر تحقیق کا انداز شامل ہونے لگا۔ دکنی تذکرہ نویسوں کے ادبی تذکرے بھی اسی

لہ تذکرہ خوشنویساں از مرزا محمد علی (مخطوطہ) سالار منگ میوزیم لائبریری حیدرآباد۔

استدلال سے استفادہ کرنے لگے۔ جس کے نتیجہ میں متن تو تحقیقی پیش کیا جانے لگا لیکن تذکرے کی جھلکیاں ان میں محسوس کی جانے لگیں۔ چنانچہ ایسے تذکرے جن میں تحقیقی مواد تو موجود ہو لیکن متن کے اعتبار سے تذکرہ نویسوں نے فن تذکرہ کی خصوصیت کو اپنایا ہو تو ایسے تذکرے ادبی سوانح کے نام سے یاد کیے جائیں گے۔ دکن کے تذکرہ نویسوں میں یہ امتیازی خصوصیت جاتی ہے کہ انہوں نے تذکرہ کو فنِ سوانح سے قریب لانے کی کوشش کی اور جس طرح تذکرے میں ایک سے زیادہ ادبی شخصیات کی سوانح درج کی جاتی تھی اسی طرح دکن میں کثیر تعداد میں ایسے تذکرے تحریر کئے گئے جنہیں متیں کے اعتبار سے ادبی سوانح میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

چونکہ سوانح ایک ہی ذات اور شخصیت کے بارے میں مواد فراہم کرتی ہے۔ اور دکن میں ایسی کئی کتابیں لکھی گئیں جن میں کئی شخصیات کی سوانح پیش کی گئیں اور اسے تذکرے کا نام دیا گیا چونکہ یہ تذکرے سوانحی خصوصیات کی پوری طرح پابجائی نہیں کرتے اسی لیے انہیں تذکرہ بطور ادبی سوانح کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسی کتابوں میں "تذکرہ خواتین دکن" ^۱ "تذکرہ یوروپین شعرائے اردو" ^۲ "سخنوران بلند فکر" ^۳ شامری جاتی ہیں۔ کیونکہ کتابوں کے ذریعہ تذکرہ نویسوں نے سوانحی حدود کا اجماع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ تذکرہ خواتین دکن میں تاریخی مواد پیش کیا گیا ہے اور یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ لیکن دکنی تذکروں میں شمار کرنے کی وجہ یہی ہے کہ سرزمین دکن کے سلطنتی کاروبار میں حصہ لینے والی ان خواتین کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے جن کی وجہ

^۱ تذکرہ خواتین دکن از محمد الدین فوق مطبوعہ لاہور ۱۹۲۰ء

^۲ تذکرہ یوروپین شعرائے اردو۔ از محمد سردار علی۔ مطبوعہ رزاقی مشین پریس حیدرآباد ۱۹۳۳ء

^۳ سخنوران بلند فکر۔ از محمد منوچ گوہر۔ مطبوعہ جے پریس مدراس ۱۹۳۶ء

سے دکن کی تاریخ میں خواتین کے کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔ محمد اللہ بن فوق نے اس کتاب کے ذریعہ خواتین دکن کا تذکرہ کر کے ثابت کر دیا کہ دکن میں بسنے والے صاحب فکر افراد کے تذکرے ہی ادبی حیثیت سے اہمیت نہیں رکھتے بلکہ خواتین دکن نے بھی ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں کہ جن پر تذکرے کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے ایک مبسوط کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ "تذکرہ خواتین دکن" دکن کی تاریخ میں مشہور خواتین کے جنگی کارناموں سے معمور ہے۔ ۱۹۲۰ء میں شائع شدہ اس کتاب کے مصنف رسالدار نظام کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے مملکت سے وابستہ ہندو اور مسلمان دکنی خواتین کا ذکر کر کے اس کتاب کو کافی اہمیت دے دی ہے اور خنزہ ہایوں، پونجی خاتون، چاندنی بی، پرتھالی، بہرہ دیوی اور جلی دیوی جیسی شخصیتوں کے انجام دیے گئے کارناموں کو سوانحی طور پر پیش کیا ہے۔ اسی لیے اس کتاب کا شمار تذکرہ بطور ادبی سوانح کیا جاتا ہے۔

ادبی شخصیتوں کی سوانح کو بطور تذکرہ پیش کرنے کی روایت دکن میں فنی طور پر ترقی پاتی رہی جس کی مثال "تذکرہ یوروپین شعراءے اردو سے کی جاتی ہے۔ اس تذکرے میں محمد سردار علی نے ان انگریزوں کی مختصر سوانح اور کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔ جنہوں نے ہندوستان میں رہ کر اردو میں شاعری کی اور اپنے کلام کا نمونہ نہ صرف شائع کیا بلکہ ادب میں مقام بھی پیدا کیا۔ مولف نے تذکرہ کو ابجدی حروف میں ترتیب دیا ہے اور کل ۳۷ انگریز شعراء کی مختصر سوانح پیش کی ہے۔ اس تذکرہ کا شمار ادبی سوانح میں اس لیے کیا جاتا ہے کہ تذکرہ نویس نے متن کے ذریعہ ادبی شاعروں کی سوانح پیش کی ہے۔

سخنورانِ بلند فکر مدراس کے شاعروں کی مبسوط سوانح ہے۔ جس میں

محمد متوڑگوہر نے مدراس میں پیدا ہونے والے فارسی اور اردو شعراء کے علاوہ ایسے شاعروں کے بارے میں بھی تفصیل پیش کی ہے جو مدراس کو اپنا وطن بنا کر وہیں بس گئے۔ یہ تذکرہ مکمل طور پر ادبی سوانح کی دلیل پیش کرتا ہے۔ تین ابواب پر مشتمل اس تذکرہ میں کسی قدر تحقیقی

سوانح جمع کی جاسکے اسی لیے مولف نے ایک یادگار کی حیثیت سے صرف شعرائے کلام کو یکجا کر دیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی تذکروں میں ادبی سوانح پیش کرنے کا اصول موجود ہے۔ اس طرح دکنی تذکرہ نویسوں نے ادیبوں اور شاعروں کی سوانح لکھتے وقت تذکرے کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے دکنی تذکروں کو ادبی سوانح کا درجہ دے دیا۔

تذکرہ بطور مذہبی سوانح :

تذکرہ کو سوانح سے ایک مختلف طرزِ نشر کا درجہ دیا جاتا ہے کیونکہ سوانح ابتداء سے آخر تک ایک ہی شخصیت کے بارے میں پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات درج کیے جاتے ہیں جبکہ تذکرہ میں ایک سے زیادہ اصحابِ کمال کے کارنامے سوانحی حالات کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔ اسی امتیازی فرق کی وجہ سے تذکرہ اور سوانح میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

تذکرہ کو بطور مذہبی سوانح پیش کرنے سے مراد ایسی کتابوں کی پیشکش ہوگی جن میں ایک سے زیادہ مذہبی شخصیتوں کی سوانح درج ہو۔ یعنی مذہبی علماء و اولیاء اور صوفیاء کے کارنامے کسی ایک کتاب میں درج کر دیئے جائیں تو اس کتاب کی حیثیت سوانح کی نہیں بلکہ تذکرہ کی ہو جائے گی۔ دکن میں ایسے متعدد تذکرے تحریر کیے گئے ہیں جن میں ایک سے زیادہ مذہبی علماء کی سوانح پیش کرتے ہیں بلکہ بعض دکنی تذکروں میں کئی سو علماء اور اولیاء کی سوانح بھی مرتب کر دی گئی ہے۔ اس قسم کے تذکروں میں "روضۃ الاقطاب" ^۱ تذکرہ اولیائے راجپور کا شمار کیا جاتا ہے جن میں تذکرہ نویسوں نے دکن کے مختلف علماء کے بارے میں مختصر حالات زندگی پیش کرتے ہوئے تذکرہ کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔

روضۃ الاقطاب ایک ایسا تذکرہ ہے جس میں خلد آباد سے وابستہ مختلف علماء کی مختصر سوانح درج کی گئی ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں حقیقی انداز و ادب نہیں رکھا گیا۔ لیکن کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولف نے فارسی کتابوں سے بطور خاص استفادہ کیا ہے جو کسی حد تک گوارا بھی ہے کیونکہ خلد آباد کے اولیائے کرام کے بارے میں مواد کی دستیابی صرف فارسی کتابوں سے ہی ممکن تھی۔ رونق علی نے اس کتاب کو اولیائے کرام کے تذکرہ کی حیثیت دے دی تو تاریخ اور سنین درج کرنے میں مولف سے بھول چوک ہوئی ہے۔ لیکن اردو میں ابتدائی نقوش کی حیثیت سے اسے گوارا کیا جاسکتا ہے۔

دکن کے تذکرہ نویسوں میں تذکرہ کو بطور مذہبی سوانح پیش کرنے والے افراد میں قاری سید شاہ روشن علی کا شمار بھی ہوتا ہے جنہوں نے "تذکرۃ اولیائے راجپور" لکھ کر دکنی تذکرہ کی روایت کو مذہبی سوانح سے مربوط کر دیا۔ راجپور کے علماء اور مشائخین کی زندگی اور حالات اور کیفیات کو سوانحی انداز میں پیش کرتے ہوئے اسی تذکرہ میں روشن علی نے تذکرہ روایت کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اور ہر مذہبی شخصیت کے بارے میں مختصر سے مواد کے ذریعہ ان کی سوانح مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ مزید کئی کتابیں دکن میں اس مقصد کے حصول کے لیے لکھی گئیں جن میں "تذکرۃ الاولیاء" قصص العلماء تذکرۃ اولیائے دکن ۱۷۷۰ "احوال العارفین" اور تذکرۃ خواصان خدا ۱۷۷۰ کافی اہمیت

۱۔ تذکرۃ اولیائے راجپور۔ از۔ قاری سید شاہ روشن علی مطبوعہ راجپور ۱۳۱۵ھ

۲۔ تذکرۃ الاولیاء۔ از۔ شیخ فرید الدین مطبوعہ مدراس

۳۔ قصص العلماء۔ از۔ میر نادر علی رعد۔ مطبوعہ مطبع حیدری حیدر آباد

۴۔ تذکرہ اولیاء دکن۔ از عید الجبار خاں ملّا پوری۔ حسن پریس حیدر آباد ۱۳۱۹ھ

۵۔ احوال العارفین از محمد نعیم مسکین شاہ۔ مطبوعہ مطبع فیض الکرم حیدر آباد ۱۳۱۶ھ

رکھتے ہیں جن میں تذکرہ کو بطور مذہبی سوانح پیش کرنے کا اثر غالب ہے۔

دکنی تذکروں میں شخصی، ادبی سوانح کے مقابلہ میں مذہبی سوانح کو بطور تذکرہ پیش کرنے کا عکس بہت زیادہ غالب نظر آتا ہے۔ اس خصوص میں دکنی تذکرہ نگاروں نے تصانیف کا طویل سلسلہ شروع کیا جن میں مذہبی شخصیات اور علماء کی زندگی کے حالات کو مبسوط کتاب کی شکل میں پیش کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی ایسی کتابوں میں "اخبار الصالحین" ^۱، "تذکرۃ الاولیاء" ^۲، "ترجمہ روضۃ الاولیاء" ^۳، "بیجا پور" ^۴، "رسول پاک کی صاحبزادیاں" ^۵ اور تذکرہ ذاکرین ^۶ موجود ہیں جن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی شخصیتوں کے مختصر حالات کتابی شکل میں اکٹھا کر کے تذکرہ کے روپ میں پیش کرنے کا رواج دکن میں ابتداء ہی میں پرمان چڑھا۔

تذکرہ بطور تاریخ:

علم تاریخ ایک مسلسل تحقیقی مواد پیش کرتے والا علم سمجھا جاتا ہے جس کے ذریعہ تاریخ، شہادت اور عہد کی بنیاد پر کسی شخصیت کی سیاسی حیثیت اور اس کے مرتبہ کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ عام طور پر علم تاریخ تذکرہ سے بالکل مختلف انداز تحریر ہے کیونکہ تاریخ میں صرف سیاسی شخصیتوں دربارداروں اور وزراء اور امراء کے طور پر ائق اور

۱۔ تذکرہ خاصان خدا۔ از۔ مصطفائی بیگم مطبوعہ اعظم پریس حیدرآباد ۱۹۳۰ء
 ۲۔ اخبار الصالحین از۔ محشوق یار جنگ ۱۳۵۲ء مطبوعہ اعظم پریس
 ۳۔ تذکرۃ الاولیاء از۔ محمد عبداللہ ۱۹۰۰ء مطبوعہ مخزن الاخبار۔

۴۔ ترجمہ روضۃ الاولیاء، روضہ کے بیجا پور۔ از۔ شاہ صیف الدین قادری ۱۳۰۰ء مطبوعہ راجپور
 ۵۔ رسول پاک کی صاحبزادیاں۔ از۔ عجمی راجپور ۱۳۲۳ء مطبوعہ دستگیری

اور جنگ و جدال کو عہد کے پس منظر میں پیش کیا جاتا ہے۔ عام طور پر تذکرے اس قسم کی شہادتوں سے متعلق نہیں ہوتے۔ علم تاریخ اور تذکرے میں بنیادی طور پر تقریبی کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ کیونکہ علم تاریخ ایک منظم اور جامع ترین علم ہونے کے علاوہ اس کا تسلسل عہد قدیم سے چلا آ رہا ہے جبکہ تذکرہ کی روایت درمیانی دور کی ایک ایسی کڑی ہے جس کے ذریعہ شخصیت کے حالات پیش کرنے کے مخصوص انداز کی نمائندگی ملتی ہے۔ تذکرہ اور تاریخ دو مختلف طریقتے اظہار ہیں۔ دکن کے تذکرہ نویسوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تاریخی مواد کی پیش کشی کے ساتھ ساتھ تاریخی شخصیتوں کے کارنامے بھی تذکرہ کے روپ میں اجاگر کیے جس کی بیشتر مثالیں دکنی تذکروں کے مطالعہ کے دوران ظاہر ہوتی ہیں۔ ”تذکرہ بابرؑ“ تذکرہ تیمورؑ“ ”تذکرہ اعظم الامراء و اسطو جاہ“ مقام جمال الدین افغانیؑ ”حیات اصفیہ“ اور اسی قسم کی دوسری کتابوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن میں تذکرہ کے فن کو تاریخ کے بیان کے لیے بھی استعمال کیا گیا بلکہ دکن کے تذکرہ نویسوں میں تذکرہ اور تاریخ

۱۔ تذکرہ بابرؑ از۔ محمد حبیب الرحمن خاں شہر دانی۔ ۱۳۲۵ھ۔ مطبوعہ حیدرآباد۔

۲۔ تذکرہ تیمورؑ از۔ احمد شفیع سنہ ۱۹۰۰ء عرشم المطابع حیدرآباد۔

۳۔ تذکرہ اعظم الامراء و اسطو جاہ از۔ عبد المجید صدیقی سنہ ۱۹۳۹ء مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد۔

۴۔ مقام جمال الدین افغانی۔ از مبارز الدین رفعت سنہ ۱۹۴۰ء اعظم اٹیم پریس حیدرآباد۔

۵۔ حیات اصفیہ از۔ محمد محبوب جنیدی سنہ ۱۳۶۵ھ حیدرآباد

کے فرق کو واضح کرنے کا احساس نہیں تھا بلکہ وہ بسا اوقات تذکرہ کا عنوان دے کر تاریخ مواد پیش کر دیتے تھے۔ چنانچہ دکن میں جتنے بھی تذکرے بطور تاریخ پیش کیے گئے ہیں ان میں یہی انداز غالب نظر آتا ہے۔ اس طرح دکنی تذکرہ نے اپنے اسلوب میں نہ صرف تغیر پیدا کیا بلکہ اس کے ذریعہ اظہار کو بھی مختلف تبدیلیوں سے وابستہ رکھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں کی یہ جدوجہد رہی کہ وہ ادب میں تذکرہ کی صنف کو نہ صرف جیتا اور جاگتا رکھیں بلکہ اُسے ہمہ گیر حیثیت کا حامل بھی بنا دیں۔

باب مقدم

دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت

دکنی تذکروں کے عہدِ ادرا اس دور کے کارناموں سے واقفیت حاصل کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنوبی ہند کے اردو ادب کی تاریخ میں تذکرہ ہی ایسی صنف ہے جس کے ذریعہ دورِ قدیم میں اردو نثر کی نمائندگی ہوتی رہی۔ دکنی نثر نگاروں نے ادب کی اس صنف کو مختلف انداز سے پیش کیا۔ جس کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ میں دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت مُسلم ہو گئی۔ کبھی بھی ادب پارے، تخلیقی کارنامے اور اصنافِ ادب سے متعلقہ مواد کی اہمیت و افادیت کو ظاہر کرنے کے لیے مختلف طریقے اپنائے جاتے ہیں تاکہ اس دور کے زبان و ادب سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ دورِ جدید میں تنقید ایک ایسا موضوع ہے جس کے ذریعہ فن پارہ اور اصنافِ ادب کی اصولی جانچ کے ساتھ ساتھ محاکاتی جائزہ بھی لیا جاتا ہے اور یہی عمل دورِ جدید میں جانچ اور صحت کا میاب کسوٹی سمجھا جا رہا ہے۔

دکنی تذکرے مکمل طور پر اردو ادب کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں جس کی وجہ سے ان میں نئی خامیاں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان میں ادبی طور پر چند ایسی کوتاہیاں بھی رہ گئی ہیں جو دکنی تذکروں کو معیاری بنانے میں حارج رہی ہیں۔ غرض یہ بات ثابت

ہو جاتی ہے کہ دکنی تذکرے صرف خوبوں سے ہی مزین نہیں بلکہ ان میں معائب اور تشکیک کی گنجائش بھی پیدا ہو گئی ہے۔ چند تذکروں میں فقی اور ادبی رجحان کے محاسن پوری طرح اجاگر ہیں اور چند تذکرے صرف حالات اور واقعات سے مصنف کی ذات کی وابستگی کو ہی فن تذکرہ کی معراج سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی تذکروں میں جہاں محاسن اُجاگر ہوتے ہیں معائب کا اندیشہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ دکن کے ابتدائی تذکرہ نویسوں کو متن کی فراہمی میں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اگرچہ فارسی اور عربی زبان کے تذکرے بطور نمونہ ان کے سامنے موجود تھے۔ لیکن وسائل کی دشواریاں انہیں بہتر اور جامع مواد کی پیش کشی سے روکتی رہیں۔

افانیت کے مرحلہ کو طے کرنے اور اہمیت کو واضح کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ کسی بھی تخلیق کے کیا مقاصد ہیں اور کس ماحول میں اس کی تشکیلیں ہوں گی۔ دکنی تذکروں کی اہمیت و افانیت کے بارے میں جب غور کیا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی نشر کی یہ پہلی صنف ہے جس کے ذریعہ تذکرہ نویسوں نے اس عہد کے صوفی، علماء، مشائخ، شاعر ادیب، سماجی کارکن، مصلحین اور ارباب عقل و فہم کی زندگی کے حالات، کارنامے اور خدمات کو سراہنے کے لیے تحسیر کا سلسلہ شروع کیا جو فنی طور پر تذکرہ "کہلایا۔ اردو ادب میں دکنی تذکروں کی اہمیت و افانیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ یہی وہ تذکرے ہیں جن کی بدولت ماضی کے جھروکوں میں ہم اپنے اسلاف کے کارناموں اور ان کی سادہ اور پُر اخلاق زندگی کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے روحانی اثرات سے انسانیت کو حاصل ہونے والے فوائد کے بارے میں بھی مستند مواد دستیاب کر سکتے ہیں۔

دکنی تذکروں میں شخصی حالات، واقعات اور کارناموں کا مواد ہی دستیاب نہیں ہوتا بلکہ ان کے ذریعہ اس دور کی سماجی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور ادبی سرگرمیوں کے بارے میں بھی تفصیلی علم ہوتا ہے جس کی وجہ سے عہد گذشتہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور

یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ جنوبی ہند میں اسلاف کے کارناموں کو محفوظ رکھنے کا تصور شمالی ہند کے مقابلہ میں بہت پہلے پروان چڑھا۔

تنقید، دورِ جدید کا ایک ایسا واسطہ ہے جس کے ذریعہ حقائق سے واقفیت اور مبالغہ کا جزبائسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت کو واضح کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ ان تذکروں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے جو دکن میں لکھے گئے۔ تاکہ حقائق سے واقفیت کے علاوہ ان کے محاسن و معائب کا پتہ چل سکے۔ تنقید کا مسلک ہی فن پارہ کے حسن کو واضح کرنا اور خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ ثابت کرنا ہو ہے کہ فن پارہ کی ادبی حیثیت کیا ہے۔ دکنی تذکروں کی ادبی حیثیت اور ان کی اہمیت و افادیت کو واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے محاسن و معائب کا جائزہ لیا جائے اور فنی طور پر ثابت کیا جائے کہ عہدِ قدیم کے دکنی تذکرہ نویسوں اور دورِ جدید کے سوانح نگاروں نے محاسن اور معائب کی پیش کشی میں کس قدر حق پرستی اور دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت واضح کرنے کے لیے انہیں (۱) دکنی تذکروں کے محاسن (۲) دکنی تذکروں کے معائب کے زیرِ عنوان بحث میں لایا جا رہا ہے تاکہ فنی طور پر دکنی تذکروں کی حیثیت کا علم ہو سکے اور ادبی طور پر ان کے معیار و انتخاب کے علاوہ اس کے مرتبے سے واقفیت حاصل ہو سکے۔

دکنی تذکروں کے محاسن :

کسی بھی فن کی خوبی اور ٹھٹھکی بہتری کو ادبی طور پر محاسن کا نام دیا جاتا ہے۔ محاسن سے مراد فن اور ہیئت کے اعتبار سے وہ خوبیاں ہیں جن سے نہ صرف تخلیق میں نکھار پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کی حیثیت اور مرتبے میں جا ذیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ عام طور پر محاسن کو خصوصیت یا خوبی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن ادبی اعتبار سے

محاسن صرف حسن اور خصوصیت کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ تخلیق کے ان مبہم گوشوں کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے جس کی وجہ سے تخلیق کے مرتبے میں اضافہ ہو سکے۔ دکنی تذکروں میں محاسن کی تلاش درحقیقت ان کی اہمیت و افادیت کو بڑھا کر ان کی ہیئت اور مواد کا جائزہ لینا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ کتنی تذکرے کن خصوصیات کی بناء پر ادبی اور معیاری سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان میں کس قدر تحقیقی و تخلیقی مواد بھی پایا جاتا ہے دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت کو واضح کرنے کے لیے ان کے محاسن کو چھ مختلف ابواب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ روایت پرستی

۱۔ ہمہ جہتی اظہار

۳۔ لسانی مزاج

۳۔ مؤرخانہ شعور

۶۔ انتخاب کا معیار

۵۔ ذاتی غور و فکر

ان چھ عنوانات کے ذریعہ دکنی تذکروں کے محاسن کو بیان کرنے کا مقصد اس بات کا ثبوت فراہم کرنا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے کس قدر جگرکاری کے بعد یہ تذکرے مرتب کیے۔ اگرچہ ان دکنی تذکروں میں تحقیقی مواد کی کمی ہے۔ لیکن اس دور میں کسی صاحب شخصیت کی زندگی کے حالات قلمبند کر دینا بھی مشکل امر تھا۔ غرض دکنی تذکروں کی اہمیت کی وضاحت کے لیے محاسن کے پہلے جزء ہمہ جہتی اظہار کے ذریعہ دکنی تذکروں کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

۱۔ ہمہ جہتی اظہار :

دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت میں اضافہ کرنے والا ایک اہم جزو دکن میں تحریر کردہ تمام تذکروں میں ہمہ جہتی اظہار ہے۔ عام طور پر تذکرہ نویس سہل پسندی سے کام لیتے ہوئے اپنے ماحل اور اطراف و اکناف کے علاقوں سے وابستہ شعراء اور علماء کی حیات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ قرب و جوار میں مہادی فزایی

کے بیشتر مواقع دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر تذکروں میں علاقہ داری منصبیت کو رد رکھا جاتا ہے۔ تذکرہ نویس اپنے دور میں اس قسم کا لحاظ نہیں رکھتا۔ لیکن دور جدید کے تنقیدی زاویے تذکرے کے متن اور مواد کے پیش نظر یہ ثابت کر دیئے ہیں کہ تذکرہ نویس نے جانب داری کے اظہار کے ساتھ ساتھ علاقہ داریت کو بھی رد رکھا ہے۔ دور قدیم کے دکنی تذکرے کسی حد تک ان خصوصیات سے بے نیاز ہیں۔ شمالی ہند کے تذکروں سے جنوبی ہند کے تذکروں کا تقابل کیا جاتا ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دسائے کی دشواریوں کے باوجود دکن کے تذکرہ نویسوں نے علاقہ داریت کو ختم کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکنی تذکروں میں شمالی ہند کے بیشتر شعراء کے حالات زندگی تحریر کیے گئے جبکہ شمالی ہند کے اکثر تذکرے جنوبی ہند کے شاعروں اور ادیبوں کے حالات زندگی پیش کرنے میں علاقائی جگڑ بندیوں کا شکار نظر آتے ہیں۔

دکنی تذکروں میں یہ انفرادیت موجود ہے کہ یہاں کے تذکرہ نویس فن کے قدردان تھے۔ یہی وجہ رہی کہ وہ تذکرہ نگاری کے دوران علاقائیت اور منصبیت کو رد رکھنے سے احتراز برتتے رہے۔ جس کا بہترین اظہار دکن کے تذکرے "گلشن گفثار" سے ملتا ہے۔ اگرچہ "گلشن گفثار" کا تذکرہ نویس دکن سے تعلق رکھتا اور اس نے تذکرے میں ۳۲ شاعروں کے مختصر حالات اور منتخب کلام جمع کیا ہے۔ جن میں بیشتر شعراء دکن سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اس تذکرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مرزا رفیع سودا، شاہ مبارک آرو، شاہ حاتم جیسے دہلی کے نامور شعراء کا ذکر ملتا ہے۔ لہٰذا دکن سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنے تذکرہ میں دلی کے شعراء کے حالات کا بیان یہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ جنوبی ہند کے تذکرہ

لے شعراء اردو کے تذکرے۔ اذکار حنیف نقوی۔ صفحہ ۲۵۵۔

نویں علاقہ داریت کے شکار نہیں رہے۔ جبکہ شمالی ہند کے ہم عصر تذکرے "نکات اشعار"
 "تذکرہ ریختہ گویاں" اور "مخزن نکات" میں علاقہ داریت اور عصیت اس حد تک ہے کہ ان
 تذکروں میں دکن کے شعراء کے تذکرہ کو سپرد قلم نہیں کیا گیا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی
 ہند کے تذکرہ نویس ہمہ جہتی اظہار کو تذکرہ کی سب سے بڑی خصوصیت سمجھتے تھے۔ یہی وجہ
 ہے کہ دکنی تذکروں میں ہندوستان کے تمام شعراء کی زندگی کے حالات پیش کرنے کی
 مقصد در بھر کوشش کی گئی ہے جبکہ شمالی ہند میں اس عہد کے تذکرے ہمہ جہتی اظہار کے پابند
 نظر نہیں آتے۔

جنوبی ہند کے دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت میں اس لیے اضافہ ہو جاتا
 ہے کہ ان تذکروں کے ذریعہ شمالی اور جنوب کے فرق کو مٹا دیا گیا اور دکنی تذکرہ نویسوں
 نے اپنے تذکروں میں متن کی پیش کشی کے دوران ہمہ جہتی اظہار کو روار کھٹے ہوئے ممکنہ
 کوشش کی کہ تذکرہ میں علاقہ داریت اور عصیت کا خاتمہ ہو جائے۔ شاید اسی کا نتیجہ
 ہے کہ شمالی ہند کے تذکروں کے مقابل جنوبی ہند کے تذکرے مختصر مواد پیش کرنے
 کے باوجود ہمہ جہتی اظہار کے معاملہ میں سبقت لے جاتے ہیں۔ دکن میں تحریر کردہ بیشتر
 تذکروں میں اس خصوصیت کا عکس پوری طرح واضح ہے۔ جس سے یہ ثبوت فراہم ہوتا
 ہے کہ دکنی تذکروں میں محاسن کا عکس بیشتر حد تک ہے اور تذکروں میں ہمہ جہتی اظہار
 کی وجہ سے ان کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

۲۔ روایت پرستی :

دکنی تذکروں کے محاسن کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے
 کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے اس فن کے فروغ کے لیے نہ صرف روایتی انداز اختیار کیا بلکہ
 روایت پرستی کو روار کھٹے ہوئے شاعروں کے تذکرے قلمبند کیے۔ دکنی تذکرے چونکہ

قدیم دور کی یا دگار میں اہل اُردو کے ساتھ دکنی دور کے ساتھ چند شمالی ہند کے شعراء کی سوانح بھی پیش کرتے ہیں اسی لیے اس کے فن میں حقیقت سے زیادہ روایت کا عکس غالب ہے۔ عام طور پر دورِ قدیم میں روایت پرستی کو ہی فن کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے دکنی تذکروں میں روایت پرستی حد درجہ نظر آتی ہے جس کا مقصد صرف یہی تھا کہ اسلاف کے قائم کردہ اصولوں پر گامزن رہ کر ہی فنِ اہل ادب کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ اسی تصور نے دکنی تذکروں میں روایت پرستی کو فروغ دیا اور دکنی تذکرے مکمل روایت کے مٹی ہو گئے۔

تذکرہ کے دورانِ حروفِ تہجی اور حروفِ جمل کی ترتیب کو رفا رکھنا دکنی تذکروں کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے روایت پرستی کو اپنا مسلک بنایا۔ اگر وہ چاہتے تو کوئی علمِ درجہ طریقہ بھی اپنا سکتے تھے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے دکنی تذکرے حد درجہ رواۃتی ہو جاتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ شمالی ہند کے تذکرہ نگاروں کے مقابلہ میں جنوبی ہند کے تذکرہ نگار عقیدت پرستی کا شکار تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکنی تذکرہ مختصر مواد فراہم کرنے کے باوجود روایت پرستی کے بہترین نمونے ثابت ہوئے۔

دکنی تذکرہ نگاروں نے روایتی انداز اپنانے کا سلیقہ فارسی کے تذکروں سے حاصل کیا۔ اگرچہ بعض دکنی تذکرہ نویسوں نے روایت سے بغاوت کو ضروری نہیں سمجھا لیکن اپنی ذہنی اپج کی جلائی اپنے تذکروں میں ضرور دکھائی۔ اس خصوص میں عطا کا کوئی شک نہیں۔

”چندستان شعراء کی ترتیب میں اپنی ایک اپج رکھی تھی۔“

پچھی نارائن شفیق، حمید الدین اورنگ آبادی، خواجہ خاں حمید، افضل بیگ
 قاتشال اور اسد علی خاں تمٹا کے تذکروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان
 تذکرہ نویسوں نے دکنی کے ابتدائی دور میں فارسی تذکروں کی تقلید کی۔ فارسی اور عربی
 کے بہترین عالم غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکرہ "عقد ثریا" اور "بیدریضا" ان دکنی
 تذکرہ نویسوں کے سامنے بطور نمونہ موجود تھے۔ جن کی روایتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دکنی
 میں تذکرے لکھے گئے۔ اگرچہ پچھی نارائن شفیق اور دیگر تذکرہ نویسوں نے روایت سے کسی
 قدر اختلاف کرتے ہوئے اُچ اور حدت کو دکنی تذکروں کی خصوصیات میں شامل کیا
 لیکن فنی اعتبار سے تذکرہ روایت پرستی سے ہی منسلک رہا۔ اس خصوص میں ڈاکٹر
 حنیف نقوی لکھتے ہیں:

”شعراے فارسی کے وہ تذکرے جو اردو تذکرہ نویسی کے آغاز سے قبل معروف وجود میں
 آچکے تھے۔ شعراے اردو کے تذکرہ نگاروں نے انہی کو اپنے لیے چراغ
 راہ بنایا انہوں نے انہی تذکروں سے ترتیب کے اصول و آداب اور
 نقد و نظر کے معیار مستعار لیے اور بعض حالات میں ان کے صفحات پر کبھی
 ہوی معلومات سے بھی استفادہ کیا۔ چنانچہ وہ تمام خوبیاں اور
 خامیاں جو فارسی تذکرہ نگاروں کے یہاں موجود تھیں اردو تذکروں
 میں بھی داخل ہو گئیں۔“

اردو تذکروں میں انتخابِ کلام اور حالاتِ زندگی کے بیان
 میں جس قدر روایت پرستی دیکھی گئی ہے وہ پیش روؤں کی تقلید کا نتیجہ
 ہے۔ دکنی تذکروں میں یہ عکس فنی طور پر شامل ہو گیا ہے اور چونکہ
 بہتر کام کی تقلید کوئی بُرا فعل نہیں اسی لیے اردو تذکروں میں روایت
 پرستی کو محاسن کے صیغہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ دکن کے تمام تذکرے ان

ان محاسن کی پابجائی کرتے ہیں۔ کچھ تذکرے مکمل تقلید کے نمونے ہیں۔ جب کہ چند تذکرے ردایت کو توڑ کر جدت کی بنیاد رکھنے کے ضامن بھی بنتے ہیں۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہی عمل انہیں امتیازی مرتبہ دلا کر تذکرہ نویسی کے فن کو دکن میں جلا ملنے کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔

۲۔ مورخانہ شعور:

تذکرے کے حسن میں بالیدگی پیدا کرنے والی صفت اور فنی طور پر زیب و زینت بڑھانے کا عمل تذکرہ میں مورخانہ شعور کے وجود سے ظاہر ہوتا ہے۔ تذکرہ نویس کوئی مؤرخ نہیں ہوتا لیکن کامیاب تذکرہ نگار کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے تذکرہ میں مورخانہ دلائل کے ذریعہ فنی نکھار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجہ میں تذکرہ تاریخی شواہد سے مالا مال ہو جاتا ہے۔

تذکرہ میں مورخانہ شعور سے مراد تذکرہ نویس کا وہ ذاتی استدلال ہے جس کے ذریعہ وہ کھوج کے ساتھ شاعر و ادیب کی تاریخ پیدائش اور وفات کے ساتھ ساتھ واقعات کی پیشکشی میں تاریخی احوال کا سہارا لیتا ہے۔ اور کسی قدر شاعر کے زمانے کے سیاسی حالات کو بھی پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ شاعر کا معیار و مرتبہ اس عہد میں کس قدر بلند تھا۔ اسی مورخانہ شعور میں دربار داری، مشاعروں کے طرز و انداز و رشابہ سرپرستی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یعنی تذکرہ میں اگر صرف شخصیت کے حالات پیش کر دیئے جائیں تو ایسا تذکرہ عہد کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تذکرہ میں پیش کردہ شاعروں اور ادیبوں کی زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ اس دور کی مختصر سی تاریخی حیثیت کو بھی واضح کیا جائے۔ چنانچہ مورخانہ شعور تذکرہ میں نکھار پیدا کرنے کی علامت ہے۔ اسی وجہ سے تذکروں کی اہمیت و افادیت کے زمرے میں اس کا شمار محاسن میں کیا جاتا ہے۔ مورخانہ شعور تذکرہ نویس کی فطرت کا جز

نہیں ہوتا بلکہ وہ مطالعہ اور تحقیق کے ذریعہ اس طرز کو اپناتا اور تذکرہ کی زینت بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض تذکرہ نویسوں کے تذکروں میں مورخانہ شعور واضح نہیں ہوتا اور بعض تذکرہ نویس اپنے تذکرہ کو مکمل طور پر مورخانہ خصوصیات سے وابستہ رکھتے ہیں۔ دکنی تذکروں میں ان دونوں طرز و انداز کا مورخانہ شعور موجود ہے۔

دکنی تذکرے فنی اعتبار سے مورخانہ مزاج نہیں رکھتے اور نہ ان میں تاریخ نویسی کی صفت پائی جاتی ہے لیکن اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا جاسکتا کہ دکنی تذکروں میں مورخانہ شعور نہ صرف غالب ہے بلکہ اعتدال کی حد تک مواد اور متن میں تاریخی استدلال پیش کیا گیا ہے۔ ورنہ دکن کے بہ کثرت تذکروں میں مورخانہ شعور گمنامی کی حد تک رہتا ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر زور فرماتے ہیں۔

”یہ واقعی اردو شاعروں کی بد قسمتی ہے کہ کسی نے بھی ایک ٹھیکٹ مورخ بن کر شعراء کے حالات کو قلمبند نہ کیا۔ اگر اس طرح کی کوئی کوشش ملتی ہے تو وہ صرف علی ابراہیم کا تذکرہ ہے۔ لیکن اس میں بھی یہ خامی ہے کہ اس کی ترکیب بجا جاتی ہے۔“ ۱

یہ حقیقت ہے کہ دکنی تذکروں میں مورخانہ شعور اس قدر واضح نہیں جتنا کہ فن تذکرہ میں ہونا چاہیے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض دکنی تذکرے اس قدر معیاری ہیں کہ انہیں مورخانہ شعور سے بے بہرہ نہیں کہا جاسکتا۔ چنانچہ اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی کے تذکرے ”گل عجائب“ کے بارے میں ڈاکٹر محمد حنیف نقوی تحریر کرتے ہیں۔

”ان اقتباسات سے مؤلف کے مورخانہ شعور کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سہا تھری

یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں انہوں نے اس تفصیل کے برخلاف
اجمال یا اختصار سے کام لیا ہے وہاں تساہل یا بے اعتنائی کے بجائے
بالعموم حالات کی نامساعدت اور حصول معلومات کی دشواریاں خلی ہیں^۱
دکنی تذکروں میں مورد خانہ شعور کا یہ اثر ثبوت فراہم کرتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے
نامساعد حالات اور مواد کی فراہمی میں دشواری کے موقع پر مورد خانہ شعور کو ملحوظ نہیں رکھا درہ
مواد کی فراہمی کے موقع پر انہوں نے اس انداز کو پوری طرح رد کر رکھا ہے۔ چنانچہ ”تذکرہ خاندان
رفت الملک“ کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی رقمطراز ہیں :

”یہ حیدر آباد کے ایک جاگیردار خاندان کا حال ہے جو نہایت تحقیق اور
تحسّس کے بعد قلمبند کیا گیا ہے۔“^۲

اس بیان کی روشنی میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے دورانی
تذکرہ ممکنہ طور پر مورد خانہ شعور کے ذریعہ فن تذکرہ کے محاسن کو اجاگر کیا جس سے دکنی تذکرہ کی
اہمیت و افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ لسانی مزاج :

فن کے محاسن میں دور جدید کے تقاضوں کے مطابق لسانی مزاج کو بھی توجہ دی
جاتی ہے۔ عام طور پر لسانی مزاج سے مراد زبان کے الفاظ و بیان کی تشریح لی جاتی ہے
لیکن حقیقت یہ ہے کہ لسانی مزاج کی تشکیل میں سب سے اہم جز زبان کے الفاظ کی بناوٹ
اور ان کی تراش و خراش کے ساتھ ساتھ عہد و عہدان الفاظ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں

^۱ شعرائے اردو کے تذکرے از ڈاکٹر حنیف نقوی۔ صفحہ ۲۸۴

۱۹۶۱ء

^۲ کتب خانہ آصفیہ کے اردو خطوط۔ از نصیر الدین ہاشمی (جلد اول) ص ۲۲۱ مطبوعہ مطبع ابراہیم حیدر آباد

کو زبان دانی کے اعتبار سے ظاہر کرنا لسانی مزاج کہلاتا ہے۔ اس خصوص میں صرف دھنوں، فصاحت و بلاغت اور تحلیل صر فی کے علاوہ صوتیات کو بھی دخل ہے لسانی مزاج زبان کی بندشوں سے زیادہ الفاظ کی ادائیگی اور اس کے استعمال کے ساتھ ساتھ اس کے مبدائے اصلی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ جسے ادبی زبان میں لسانی مزاج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دکنی تذکروں میں لسانی خصوصیات حد درجہ موجود ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے انتخاب کلام کے دوران ان خصوصیات کو ملحوظ رکھا ہے جو دورِ جدید میں لسانی مطالعہ کا جز سمجھے جاتے ہیں۔ تذکرے لکھے جانے کے دور میں علم لسانیات کا کوئی وجود نہیں تھا لیکن دورِ جدید کے محققین نے دکنی تذکروں کے مطالعہ کے بعد ثابت کیا ہے کہ دکنی تذکرہ نویس لسانی مزاج کے پیش نظر تذکرہ کی روایت کو فروغ دیتے ہوئے جس کے ساتھ ہی ان کا فنی شعور بھی کار فرما ہوتا تھا۔

شمالی ہند کے تذکروں کے مقابلہ میں جنوبی ہند کے تذکرے لسانی مزاج کی پوری طرح پابجائی نہیں کرتے۔ دکنی تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں میں شاعروں کے کلام کے نمونے کی پیش کشی کے ذریعہ لسانی مزاج کی نمائندگی کی ہے۔ لیکن یہ پیش کش اس قدر مبہم ہے کہ اس کا اظہار ممکنات میں سے نہیں ہے۔ پھر بھی دکنی تذکرے اس حیثیت سے لسانی مزاج کی ہم آہنگی کرتے ہیں کہ جس دور میں شمالی ہند کے شاعروں کے تذکرے لکھے گئے اسی عہد میں شاعری کرتے والے فنکاروں کے کلام کو لکھا کر کے دکنی تذکرہ نویسوں نے دہلوی زبان اور دکنی میں لسانی فرق کو واضح کرتے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ دکنی اور دہلوی زبانوں میں امتیاز پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ دونوں اردو کے ہی انداز بیان ہیں۔ اس کا بہترین اظہار صرف دکنی تذکروں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ اگر دکنی تذکرہ نویس یہہ تذکرے نہ لکھتے تو یہ ممکنات میں سے نہیں تھا کہ دکنی زبان پر بیرونی زبان کے اثرات

کا محکمہ کیا جاسکے۔ دکنی تذکرہ نویسوں نے جنوبی ہند کے شعراء کے ساتھ ساتھ شمالی ہند کے شاعروں کے زندگی کے حالات اور کلام کو اپنے تذکروں میں پیش کر کے دکنی زبان کی لسانی خصوصیت کو واضح کرنے کی کوشش کی جو دکنی تذکرہ نویسوں کے لسانی مزاج کی بہترین مثال ہے۔

۵۔ ذاتی غور و فکر :

تذکرہ نگاری کا فن ادبی اعتبار سے سیرت اور تاریخ سے قریب رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرے ذاتی غور و فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ سخنوری کے میدان میں شاعروں کی سرگرمیوں اور ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو پیش کرنے کے لیے تذکرہ نگاروں کو غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی تذکرے کے نمونے کو سامنے رکھتے ہوئے تذکرہ نگار اپنی فکری صلاحیت کو پروان چڑھاے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ شاعروں کے حالات، حیات اور کارنامے پیش کرنے کے لیے ذاتی غور و فکر سے کام لے۔ ورنہ تذکرہ خالق کی خوبیوں سے مستثنیٰ ہو جائے گا۔ اس اعتبار سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ تذکرہ نویس صرف حالات و واقعات کو جوں کا توں پیش کرنے والا کوئی نقال نہیں ہوتا بلکہ ایک فن کار ہوتا ہے اسی لیے تذکرے کی ترتیب کے موقع پر بڑے شخصی دل چسپی اور ذاتی غور و فکر کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اگر اس خصوصیت کو بالائے طاق رکھ دے تو ایسا تذکرہ ادبی معیار سے کمتر ہو جائے گا۔

دکنی تذکروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے شعراء کے حالات زندگی اور وفات کی تاریخوں کے قیمن کے علاوہ ان کے دور کی خصوصیت کے ساتھ ساتھ ان کی فنی افضلیت کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے دکنی تذکرے اہمیت اور افادیت کے نئے رجحانات کو قائم کرتے ہیں۔ اور یہی محاسن دکنی تذکرہ نگار کو مقبولیت بخشتے ہیں۔ تذکروں میں ذاتی غور و فکر کو ظاہر کرنے کے لیے اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی

کے تذکرہ نگار عجائب کے بارے میں ڈاکٹر محمد حنیف لکھتے ہیں :

"تمنا کے یہاں تعارف نویسی کا عام معیار بہت بلند ہے۔ وہ شعرائے اردو کے ان تذکرہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کی سلیقہ مندی کسی بھی صاحب نظر نقاد سے خراج تحسین حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے تذکرہ نگاری کے فن کو اس مقام تک لے آنے کی کوشش کی جہاں ان کی دین، ادب کے مورخ کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔"

تذکرہ نویسی کے لیے تذکرہ نگار کی جدوجہد اور اس کی فکر کی بالیدگی کا اندازہ اس طرح بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب تک تذکرہ نگار غور و فکر سے کام نہیں لیتا اور شاعروں کی زندگی کے بارے میں تفصیلات حاصل کرنے کے لیے جستجو نہیں کرتا اس وقت تک تذکرہ نگار کی تشکیل ممکن نہیں۔ عام طور پر تذکرہ نگار ایک تالیف کا درجہ رکھتا ہے اور یہ تصور عام ہے کہ تالیف کی پیش کشی کے لیے مؤلف کو زیادہ جانفشانی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن یہ تصور اس وقت غلط ثابت ہو جاتا ہے جبکہ تذکرہ نگار اپنی تالیف میں شخصیت کی سوانح کے بعد اس کے کارناموں اور خدمات کے ساتھ ساتھ سیرت پر روشنی ڈالنے کے لیے غور و فکر کا سہارا لیتا ہے۔ اور اپنی ذہنی اور تخلیقی صلاحیت کے ذریعہ صاحب تذکرہ کی شخصیت کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں۔

"بعض تذکرے بادی النظر میں یکساں نظر آتے ہیں اور ان میں مضمون کا اتحاد دکھائی دیتا ہے۔ مگر نظر فائر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر تذکرہ اپنی کوئی

نہ کوئی مستقل خصوصیت رکھتا ہے جو دوسرے تذکروں میں نہیں پائی جاتی
 کوئی سیرت کی تصویر کشی کرتا ہے۔ کوئی اصلاح سخن کے لحاظ سے اہم
 ہے کوئی عمدہ انتخاب پیش کرتا ہے۔ کوئی ایک خاص دور اور گروہ کا تذکرہ
 ہے۔ ان میں سے کوئی جامع ترین ہونے کا مدعی ہے اور کوئی مختصر لکھنے کا
 اقرار ہے۔ غرض ہر ایک میں جدا جدا امتیازات موجود ہیں جو ان میں سے ہر
 ایک کے الگ وجود بقائے لیے وجہ جواز ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہ ثابت کر دی ہے کہ کوئی بھی تذکرہ فنی اعتبار سے ایسا نہیں
 ہوتا جو بغیر ذاتی غور و فکر کے لکھا جاسکے۔ جس طرح ادب کی دیگر اصناف کی پیش کشی
 کے لیے تخلیق کار کو غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے اسی طرح تذکرہ نویسی کے دوران بھی
 ذاتی غور و خاص ضروری ہے اور یہ بات پائے ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ کئی تذکروں میں ذاتی
 غور و فکر کا عکس نمایاں ہے جو تذکرہ کے محاسن میں شامل ہونے کی وجہ سے ان کی اہمیت و
 افادیت کو دو بالا کرنے کا ضامن ہے۔

۶۔ انتخاب کا معیار:

تذکروں میں شاعروں کی زندگی کے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ ان
 کے کلام کا انتخاب بھی درج ہوتا ہے جو تذکرہ کی خصوصیات میں شامل ہے اور اس کا شمار
 بھی محاسن میں کیا جاتا ہے۔ عام طور پر شعر کا انتخاب مشکل امر ہے اس مسئلہ کو تذکرہ نویس
 حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اردو کے تمام تذکروں میں شاعروں کے حالات کے علاوہ

ان کا منتخب کلام بھی درج کیا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تذکرہ میں کلام کا انتخاب بھی ایک اہم جز ہے اور دکنی شعراء نے اس اصول کی پیروی کی ممکنہ کوشش کی ہے۔ جس کے ذریعہ اصلاح سخن اور تنقید کلام کا حق ادا کیا گیا ہے۔ عام طور پر تذکرہ نویس اپنے فن کو واضح کرنے اور ادب کی تاریخ میں شاعر کا درجہ متعین کرنے کے لیے انتخاب کلام اور اصلاح سخن سے کام لیا کرتے تھے تاکہ تذکرہ میں شاعر کے مذاق اور مزاج سے متعلقہ اشعار کو تذکرہ نویس اپنے ذوق کے مطابق پیش کر سکے۔ تذکرہ میں انتخاب اشعار کا مقصد صرف اپنے مذاق کی نمائندگی کرنا ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعہ ذوق صحیح کی ترقی کا سامان فراہم کرنا ہوا کرتا تھا۔ دکن کے تمام تذکروں میں یہ خصوصیت واضح طور پر پائی جاتی ہے جس کے ذریعہ تذکرہ نویسوں نے شاعروں کی صفات اور ان کی وضع داری کو پیش کیا ہے اور اسی وجہ سے تذکرے یادگاری حیثیت کے حامل ہونے لگے۔ اس خصوصیت سے تنگ آکر ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں

”تذکرہ نگار اپنے ناموروں میں نیکی، شرافت پابندی وضع، خوش اخلاقی اور عام اوصاف حسنہ کو بطور خاص نمایاں کرتے ہیں۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ تذکرہ نگار جن شاعروں کے اوصاف کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں ایک چیز وضع داری بھی ہے یہ استقلال مزاج اور ثابت قدمی کا محیر العقول نمونہ پیش کرتی ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ ہمارے بزرگ مشروع میں جس وضع یا طریقہ کو اختیار کر لیتے تھے عمر بھر اس پر قائم رہا کرتے تھے۔“

ان اعتراضات اور خصوصیات کے پیش نظر اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نویس انتخاب کلام کے ذریعہ یادگاری خصوصیت کو واضح کرنا چاہتے تھے۔ جس کے ساتھ ہی یہ مقصد بھی

کار فرما تھا کہ انصاف اور صداقت کے ساتھ حقیقت نگاری کی جائے چنانچہ انتخاب کلام کے دوران جو خصوصیت زبانی گئی ہے وہ راست بازی ہے۔ اور تذکرہ نگار اسے قائم رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر سیدہ جعفر رقمطراز ہیں:

”تذکروں کی تنقیدی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تذکرہ نویسی میں تنقید نگاری کا ہیولہ بنتا ہوا نظر آتا ہے۔ شعرائے کلام پر رائے دینا اور انتخاب کلام پیش کرنا یا معاصرین سے ان کا مقابلہ کرنا یا قادمی شعراء سے اردو شعراء کا موازنہ کرنا بغیر تنقیدی صلاحیت کے کیسے ممکن تھا۔ تذکروں کا ایک اور تنقیدی پہلو یہ بھی تھا کہ میر، میر حسن، قائم، شیفتہ اور مصحفی وغیرہ نے جہاں ضرورت محسوس کی تھی کلام پر اصلاحیں بھی دیں تھیں اصلاح کلام دراصل فنی اور عملی تنقید ہی کا ایک پر تو ہے۔ اصلاح ایک طرح سے اصولی تنقید اور عملی تنقید کا بڑا اچھا امتزاج ہوتا ہے۔ تذکروں میں جو اصلاحیں ملتی ہیں ان کی نوعیت زیادہ تر مصوری اور لسانی ہے معنوی پہلو بھی ان کے پیش نظر رہا ہے۔ ان اصلاحوں میں صرف فصاحت، طرز ادا کی دلفریبی، عروض کی پابندی، ضائع بدلے کے استعمال اور زبان و محاورہ بندی کے اصولوں کے علاوہ معنی آفرینی، ندرت خیال اور نزاکت تخیل پر بھی توجہ کی گئی ہے۔ تذکروں کی اصلاحیں جا بجا تنقیدی اشارے لی ہوئی ہیں اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ تذکرہ نگار فن کے کتنے رمز آشنا ادب کے کیسے اچھے پارکھ تھے۔“ لہ

اس بیان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ تذکرہ کے محاسن میں انتخاب کلام کے دوا

تذکرہ نویسوں نے نہ صرف تنقیدی انداز کو رد رکھا بلکہ اصلاح سخن پر بھی توجہ دی۔ اس اعتبار سے دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت کے باب میں "انتخاب کلام کا معیار" نہ صرف تنقید کلام کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ اصلاح سخن کے کارناموں سے بھی واقفیت دلاتا ہے۔ جن کے عمل سے دکنی تذکروں میں محاسن کی بازیافت ہوتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نویس انتخاب کلام اور اصلاح سخن کے ذریعہ تذکروں میں فنی طور پر نکھار پیدا کرنے کے علاوہ ان کے معیار کو بھی بلند کرنا چاہتے تھے۔

دکنی تذکروں کے معائب :

کوئی بھی فن جب ابتدائی مارج میں ہوتا ہے تو لازمی طور پر اس میں کسی نہ کسی ٹیکنیکی کمی کا ہونا لازمی ہے۔ دکنی تذکروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس دور کی یادگار ہیں جبکہ انہوں میں فن تذکرہ نویسی ابھی خال خال ہی تھا۔ جس کے نتیجہ میں ادبی طور پر ان تذکروں میں کسی نہ کسی قسم کی خامی کا پایا جانا فطری امر ہے۔

ادبی طور پر معائب سے مراد فن کی وہ خامیاں اور کوتاہیاں مراد لی جاتی ہیں جو شعوری یا لاشعوری طور پر فنکار سے سرزد ہوں اور جنہیں فن کے اصول نے غلط قرار دیا ہو۔ یعنی معائب سے مراد وہ ٹیکنیکی اور فنی بے ضابطگیاں ہیں جو کسی فن پارہ میں دانستہ و نادانستہ طور پر رواج پا گئی ہوں۔ اس طرح معائب ادبی اعتبار سے غیر معقولیت اور ادب کے محرکات میں رکاوٹ پیدا کرنے والا عمل ہے جس سے فن کے اصول اور طریقے نہ صرف متاثر ہوتے ہیں بلکہ ادبی بے ضابطگی کے علاوہ مذاق سخن اور معیار فن میں بھی تفریق پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی فن کی اہمیت و افادیت میں معائب کو پست نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انحراف نہیں برتنا جاسکتا کہ حقائق کی بازیافت کے لیے محاسن کے ساتھ ساتھ معائب کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ دکنی تذکروں میں موجود

فنی معائب کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۲۔ غیر تفصیلی مواد

۱۔ زبان کا سقم

۴۔ مآخذات اور حوالے

۳۔ ہمدردانہ رویہ

دکنی تذکرہ نویسی فن کی معراج نہیں اور نہ ہی اس کے ذریعہ فن تذکرہ کے مکمل اصولوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ دکنی تذکرے اپنے ماحول کے اعتبار سے نقشِ اول کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے مواد اور متن میں معائب کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں کو فنی طور پر تذکرہ نگاری کے لیے بطور نمونہ فارسی کے بہترین تذکرے دستیاب ہو چکے تھے لیکن ان سے استفادہ کے باوجود دکنی تذکروں میں معائب کی زیادتی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے فنی اعتبار سے اغلاط کو روا نہیں رکھا بلکہ بیشتر دکنی تذکرے شخصیتوں کے بارے میں تاریخ و متن کی پیش کشی میں نامساعد وجوہات کی بنا پر کج روی کے علمبردار بن گئے۔ اگر دکنی تذکرہ نویسوں کو ہر شخصیت کے بارے میں موزوں ترین مواد اور اس کے تمام تر حالات دستیاب ہو جاتے تو وہ کبھی اپنے فن میں معائب کا اظہار نہ کرتے۔ دکنی تذکروں میں انداز فکر اور بیان کے پیرائے میں کوئی سقم نہیں بلکہ ادبی جاسنج بڑتال کی کسوٹیوں میں فرق نظر آتا ہے اس کے ساتھ ہی شخصیت کے تمام واقعات دکنی تذکروں میں واضح نہیں ہوتے۔ دکنی تذکروں کی فنی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہیں چند عنوانات کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے تاکہ دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت کے لیے جن کے ساتھ ساتھ معائب سے بھی واقفیت ہو سکے دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت واضح کرنے کے دوران ایک طرفہ رویہ سے کام نہیں لیا گیا۔ اس کے علاوہ جدید تنقید کا تقاضا بھی یہی ہے کہ فنی پارہ کی پیش کشی میں محاسن اور معائب دونوں کو پیش نظر رکھا جائے۔

۱۔ زبان کا سقم :

دکنی تذکروں میں صنعت گرو کا رجحان فارسی تذکروں سے دل چسپی کے زیر اثر پیدا ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دکنی تذکرہ داروں میں زبان اور بیان کے انداز میں کسی قدر قارسیت کا اثر غالب ہے اگرچہ یہ تذکرے دکن میں لکھے گئے۔ اور دکن میں بود و باش اختیار کرنے والے شاعروں کی زندگی کے حالات پیش کرتے ہیں لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ان تذکروں میں بیان فارسی زبان میں دیا گیا ہے۔ یعنی دکنی کے شاعروں کی زندگی کے حالات فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ اور ان کا نمونہ کلام دکنی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ اس تفریق کو زبان کے سقم میں شامل کیا جاسکتا ہے کیونکہ جس دور میں یہ تذکرے لکھے گئے اس وقت دکنی میں شعر گوئی کا بچھا ہونے لگا تھا جس کے بعد لازمی امر تھا کہ تذکرے بھی اسی زبان میں لکھے جاتے اس کے علاوہ دکنی تذکروں میں زبان کے سقم کا ایک اور انداز پایا جاتا ہے جو اردو کے ہر تذکرہ کی روایت میں داخل ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں۔

”تذکروں کو دل چسپ، جاذب نظر اور مقبول خاص دعام بنانے کے لیے تذکرہ نگاروں نے رنگین زبان اور شاداب و شگفتہ انداز بیان کو اپنایا تھا تذکرہ نگاری کے قدیم عہد میں مقفی و مستحشر کو قبول عام کی سند حاصل ہو چکی تھی۔ معمولی معمولی باتیں بھی جو براہ راست انداز میں آسانی بیان کی جاسکتی تھیں عبارت آرائی، لفاظی، صوری نمائش اور ظاہری طمطراق کے التزام کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل بن جاتیں۔“

تذکرہ نگاری کا قدیم دور دکن سے ہی وابستہ ہے اور ان تذکروں میں زبان کا سقم ہی قصبہ ہے کہ اکثر تذکرے شخصیت کی زندگی کے بارے میں مواد فراہم کرنے کی بجائے زبان وانی سے کام لیتے ہیں۔ بیان کی شگفتگی اور الفاظ کا بہاد اس قدر تیزی کے ساتھ دکنی تذکروں میں رواں دواں ہے کہ تذکرہ نویس کے بیان کی وجہ سے شخصیت کے تمام کارنامے الفاظ کے سیلاب کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دکنی تذکروں بالخصوص عہد قدیم کے تذکروں میں یہ رجحان بدجہز اتم موجود ہے کہ تذکرہ نویس شخصیت کے حالات کی پیش کشی سے ناامد اپنے بیان کو بہت زیادہ دلکش بنانے پر توجہ دیتا ہے تاکہ اس کی زبان کی بوقلمونی سے عام انسان متاثر ہو جائے۔ دکنی تذکروں میں اسی قسم کا مزاج نہ صرف زبان کے سقم کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس انداز کے ذریعہ دکنی تذکرہ نویسوں نے اپنے فن میں معائب پیدا کر کے اس کی اہمیت و افادیت کو کسی قدر گھٹا دیا۔

ابتدائی عہد کے تمام تذکروں میں زبان کے سقم کا رجحان عام ہے جس کی وجہ سے یہ فیصلہ دینا قطعی غلط ہے کہ صرف دکنی تذکرے سقم زبان کے مرکب ہوئے ہیں۔ چونکہ تمام قدیم تذکروں میں روایتی طور پر زبان کے سقم کا انداز یکساں پایا جاتا ہے اور ان میں یہ خامی دور قدیم کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسی لیے قدیم تذکروں میں موجود زبان کے سقم کو تنقیدی بحث کا ذریعہ بنانا حق پرستی نہیں کیونکہ اس عہد ہی زبان کے انداز بیان کی روش اسی نہج کی تھی جو آج کے دور میں قابل قبول نہیں۔ اسی وجہ سے تذکروں میں زبان کے سقم کو تنقید کا موضوع نہیں بنایا جاسکتا اور اس پر مزید بحث اس فن کی روایت کو توڑنے کے مترادف ہے۔

۴۔ غیر تفصیلی مواد:

دکنی تذکروں میں اگرچہ فن کی روایت عموماً کی جاسکتی ہے لیکن تذکروں میں فن کی تاریخ پر یہ ناواقفی بھی گئی ہے کہ

وہ شخصیت کے بارے میں تفصیلی مواد فراہم نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ تذکرہ نگار متقی کی پیش کشی میں تساہل سے کام لیتا ہوا نظر آتا ہے جو فنی طور پر ایسا مقم ہے جسے غیر تفصیلی مواد کے زیر عنوان بحث میں لایا جاتا ہے۔ عام طور پر دکنی تذکروں میں متقی کی پیش کشی کی حد تک نتیجہ کار حجان بُری طرح کھٹکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تذکرہ نگار شخصیت اور سیرت کے معاملہ میں بیان کے دوران رفاہی سے کام لے کر اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ کسی شاعر کے بارے میں مفصل حالات سے واقفیت نہ رکھتا ہو تو کسی طرح بھی اس سے دامن چرایا جائے۔ اس خصوص میں تذکروں پر اعتراض کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔

"ان سے مفصل حالات معلوم نہیں ہوتے اور ریختن تحقیق کی بجائے نقل در نقل ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں ماخذ کا ذکر نہیں ہوتا۔"

شاعر کی شخصیت اور اس کے حالات تذکرہ میں بیان کرتے وقت تذکرہ نویس کا میلان صرف شاعر کے کلام سے دل چسپی ہر کرنا ہوتا ہے چونکہ وہ کسی شاعر کی شہرت کوئی سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کے کلام کو یکجا کرنے کے لیے شاعر کے مختصر سے تعارف کا سہارا لیتا ہے جس کی وجہ سے شاعر کے بارے میں متن کی فراہمی کیے بغیر جو کچھ سہارا نہیں لیتا جس کے نتیجے میں اردو کے تمام تذکروں میں فروگزاشت اور تساہل عام طور پر دکھائی دیتا ہے۔ جس سے تذکروں کے معائب میں نقصان ہوتا ہے۔ اکثر تذکروں میں شاعروں کے حالات کے علاوہ سنین کی پیش کشی سے بھی لاپرواہی برتی گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ غیر تفصیلی مواد تذکروں میں اس حد تک کارفرما نظر آتا ہے کہ بعض تذکروں میں صرف شاعروں کے تخلص کو لکھ کر نمونہ کلام پیش کر دیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں نے

۱۰ شعراء اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن۔ از ڈاکٹر سید عبداللہ۔ صفحہ نمبر ۱۱

مطبوعہ مسیحہ رشید وارث دہلی۔

متن کی پیشکش کے لیے شاعر کے نام اور حالات سے مکمل واقفیت کے لیے جگہ کو شئی سے کام نہیں لیا۔ اکثر شاعروں کے بارے میں مواد پیش کرنے کے دوران تذکرہ نگار صاف طور پر نام سے عدم واقفیت اور تاریخ پیدائش اور وفات سے لاعلم ہونے کا ذکر کرتے ہوئے صرف اس کے کلام کی خصوصیات کو پیش کر دیتا ہے۔ ان تمام خامیوں کے پیش نظر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ان تذکروں میں شاعروں کی شخصیت اور ان کی زندگی کے حالات چھپ کر رہ گئے ہیں۔ جو تذکروں میں غیر تفصیلی مواد کے نمائندہ ہیں۔ ان کی تذکروں کی اہمیت و افادیت کے جائزہ کے دوران اس عمل کو معائب میں شمار کیا جائے گا۔ دکن کے تذکرہ نگاروں میں اسد علی خاں تھنا ایک ایسے شاعر ہیں جن کے تذکرہ "گل عجائب" میں ترتیب متن اور مواد کی تفصیل پوری طرح نمایاں ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر حنیف نقوی تھنا کی اس خوبی کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تھنائے اس تذکرہ میں جن شاعروں کو شامل کیا ہے وہ جہاں ان کے ہم عصر تھے وہیں ان سے بیشتر ان کے ہم وطن بھی تھے یا پھر کسبِ معاش کے سلسلے میں دکن سے تعلق رکھتے تھے۔ اس قربِ زمانی و مکانی سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اکثر شعراء کے بارے میں نہایت مفصل اور اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ ولادت و وفات اور دوسرے سوانح زندگی کی تواریخ اور سنین کے حوالے بھی ان کے یہاں بکثرت ملتے ہیں۔" ۱

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترتیب متن اور تفصیل مواد کی پیش کشی کے لیے

تذکرہ نویسوں کو موزوں ماحول نہ مل سکا۔ اور اس دور میں مواد کی فراہمی دشوار مسئلہ تھی۔ اسی لیے تذکروں میں تفصیلی مواد بکثرت دکھائی دیتا ہے۔ اگر تذکرہ نویسوں کو مواد کی دستیابی کے تمام مواقع فراہم ہو جاتے تو قدیم دور میں ہی سوانح نگاری کا آغاز ہو جاتا ہے۔ غیر تفصیلی مواد کی وجہ سے اردو نثر میں تذکرہ کی صنف قائم ہوئی اور تذکروں میں غیر تفصیلی مواد فنی طور پر معائب میں شامل ہونے کے باوجود بھی اہمیت رکھتا ہے۔

۳۔ ہمدردانہ رویہ :

ادبی طور پر کسی بھی فن میں فن کار کا رویہ عام طور پر تائید یا تردید کے حق میں رہتا ہے۔ یہاں تک تنقید کا سوال ہے۔ اس حقیقت سے گریز نہیں برتا جاسکتا کہ فن کی جانچ کے معاملے میں فن کار کو غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ قدیم تذکروں کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اس دور کے تذکرہ نویسوں میں اخلاقی رجحانات اس قدر کارفرما تھے کہ انھوں نے اپنے تذکروں میں جانب داری کی بجائے ہمدردانہ رویہ اختیار کیا۔ کئی تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تذکرہ نویسوں نے شاعروں کی زندگی کے حالات مرتب کرتے وقت امور شعرا میں رائج شدہ اوصاف حمیدہ کو پیش کرنے میں نہ صرف ہمدردی سے کام لیا ہے بلکہ بسا اوقات مبالغہ کی حد تک بیانات قلمبند کر دیے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ در قدیم میں تذکرہ نویس خوبیوں کو مختلف الفاظ اور پیرائے میں بیسالی کرتا فن تذکرہ کی خصوصیت سمجھتے تھے۔ جس کے نتیجے میں تذکرے ہمدردانہ رویہ کے حامل ہو گئے۔ تذکروں کی اس فنی خامی کو اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں :

”تذکروں کے تمام انتخابات، نمائندہ انتخابات نہیں۔ ان میں بعض جگہ خامیاں نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ انتخاب بعض اوقات محض انفرادی ذوق اور وجدان کی رہنمائی کا رہیں منت ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ تذکرہ نویس کی

ہم درویاں جس شاعر کے ساتھ ہوتیں نفسیاتی طور پر اس کا بے جان، سپاٹ اور پھپھا
 شعر بھی تذکرہ نویس کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ وقت اساتذہ کے بہترین شعر
 بھی تذکرہ نگار کی توجہ کے محتاج ہوتے ہیں اور نسبتاً کم تر درجہ رکھنے والے
 اشعار پر تذکرہ نگار سر دھنسنے لگتا ہے۔ چند مثالوں کو چھوڑ کر یہ انتخابات اپنے
 عہد کے مذاق سخن اور معیار فن سے خاصی مطابقت رکھتے تھے۔ لہ

تذکرہ نگاروں کے ہم دردانہ رویوں کی جھلکیاں اس بیان میں پوری طرح نمایاں ہیں
 دکنی تذکروں میں بھی یہی انداز غالب ہے جس کا نتیجہ یہی ہے کہ اہمیت و افادیت کے لحاظ
 دکنی تذکروں میں ہمدردانہ رویہ فنی طور پر معائب کا غماز ہے۔ دکنی تذکروں میں اس رو
 کی کارفرمائی بسا اوقات بجا نظر آتی ہے اور اکثر موقعوں پر یہ رویہ بے جا دکھائی دیتا ہے۔
 غرض دکنی تذکروں میں اردو کے دیگر تذکروں کی طرح ہمدردانہ رویہ کے ذریعہ تذکرہ نویس
 اپنے من پسند شاعری کی خصوصیات کو واضح کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان کا ذوق شع
 ر کافی بلند ہے اور یہی عمل سقم کی بنیاد بن گیا۔

دکنی تذکروں میں ہمدردانہ رویے کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف ظاہر
 ہو جاتی ہے کہ دکنی تذکرہ نویسوں نے اپنے ذوق صحیح کی نمائندگی اور شعر سمجھنے کی صلاحیت
 واضح کرنے کے لیے تذکروں کے دوران شاعری کی زندگی کے حالات سے زیادہ ان کے کلام سے
 ہمدردی دکھائی جو درجہ عید کی تنقید میں فنی طور پر معائب میں شامل ہے۔ ایک اعتبار سے تذکرہ
 نویسوں کا ہمدردانہ رویہ اس عہد کی ضرورت کے لحاظ سے مناسب تھا لیکن دورِ حاضر میں تنقید
 اصول اس کی منافی کرتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ دکنی تذکرے جس دور کے نمائندہ ہیں اس
 وقت تنقیدی اصول کارفرما نہیں تھے۔ بلکہ ہر تذکرہ نویس اپنے مزاج کی مطابقت کا لحاظ

کرتے ہوئے تذکرہ کرتا تھا جس کے نتیجے میں دکنی تذکرے ہمدردانہ رویہ سے منسلک ہو گئے۔

۴۔ مشکوک حوالے و ماخذات :

دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت کا جائزہ لیتے وقت جب ان کے محاسن اور معائب پر غور کیا جاتا ہے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں دکنی تذکرے محاسن کی نمائندگی کرتے ہیں وہیں معائب کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ دکنی تذکروں کے معائب میں مشکوک حوالے بھی شامل ہیں۔ عام طور پر تذکرہ نویس ترتیب و تذکرہ تذکرہ کے دوران اس بات کو ملحوظ نہیں رکھتے کہ ان کے حوالے فنی طور پر تشکیک پر مبنی ہیں۔ یعنی تذکرہ نویس شاعروں کی زندگی کے حالات اور واقعات کے بیان کے دوران کسی ٹھوس ثبوت کا سہارا نہیں لیتا اور نہ ہی کسی ایسے اہم حوالہ کی دلیل پیش کرتا ہے کہ جس کی وجہ سے شاعر کے بارے میں پیش کردہ متن میں شک کی گنجائش نہ رہے بلکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ تذکرہ نویس سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والے علم کے معترف تھے جس کے نتیجے میں انھوں نے صرف انہی باتوں کو ضبط تحریر میں لایا جو بطور روایت چلے آ رہے تھے اور جن کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ تذکروں میں اس قسم کا عمل اختیار کرنا مشکوک حوالہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس میں تذکرہ نگار تساہل یا بے اعتنائی کی وجہ سے چند ایسے بے سرو پا حوالے رقم کر دیتا ہے جن کی حقیقت پر شک و شبہ کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ دکنی تذکروں میں مشکوک حوالے اور ماخذات کا عمل دخل ہندوستان کے تمام تذکروں میں موجود ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر حنیف نقوی لکھتے ہیں۔

”اس زمانے میں نہ تو ولادت و وفات اور دوسرے واقعات کی

تاریخیں محفوظ رکھنے کی روایت موجود تھی اور نہ ہر شخص کے بارے میں اس قسم کی معلومات فراہم کرنا عملاً ممکن تھا۔ اس لیے تذکرہ نگار ایک زمانے

تک اس طرح کے حوالوں کو غیر ضروری خیال کرتے رہے۔“ ۱۷

دکنی تذکروں میں حوالوں کی تشکیک اسی وجہ سے دکھائی دیتی ہے کہ تذکرہ نویسوں نے اپنے عہد کی روایت کے مطابق تذکرے لکھے۔ جس کی وجہ سے ان تذکروں میں حوالوں کا ذکر کمیاب ہے۔ اسی طرح تذکروں میں ماخذات کا عمل بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بعض اوقات یہی ماخذات تذکروں کی اہمیت کو بڑھا دیتے ہیں۔ اس خصوص میں حوالے، اقتباسات اور ماخذات کی ضرورت کو تذکروں میں واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر حنیف نقوی لکھتے ہیں۔

”تذکروں میں کبھی کبھی ایسی کتابوں کے حوالے اور اقتباسات بھی مل جاتے

ہیں جو بعضی طور پر فنا ہو چکی ہیں یا جن کی بازیابی کے امکانات مفقود ہیں۔“ ۱۸

دکنی تذکروں میں ”گل حجاب“ ”تحفۃ الشعراء“ ”ریاض حسنی“ گلشن گفتار اور

دیگر تذکروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں بعض ایسے ماخذات بھی درج کیے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے بعض تاریخی، سماجی اور ثقافتی واقعات کی عکس کشی بھی ہوتی ہے اگرچہ ان ماخذات میں ٹھوس حقیقت کا کسی قدر فقدان نظر آتا ہے مگر ان کی اہمیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ دکنی تذکروں کے علاوہ اور کسی کتاب میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ جس سے ثبوت ملتا ہے کہ دکنی تذکرے اپنے عہد کی تصویر کشی کی جانب راغب تھے۔ دلی اور رنگ آبادی کے حالات اور دکن میں شاعروں کی چشمکوں کے بارے میں اگر کسی کتاب میں مواد دستیاب ہو سکتا ہے تو وہ صرف تذکرے ہیں۔ بلکہ بعض دکنی تذکروں سے ایسے ماخذات بھی مل جاتے ہیں جن سے مختلف علاقوں کی ادبی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ کی کتابیں اس قسم کے متن کی پیش کشی میں پیچھے ہیں۔ اسی لیے تذکروں کی اہمیت واقعات کے دوران ادبی تاریخ کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی میں ادب اور شاعری کے عمل و دخل کو ثابت کرنے کے لیے

تذکرے مسلم ثبوت کا درجہ رکھتے ہیں جس سے کوئی بھی ادب کا طالب علم منکر نہیں ہو سکتا۔
دکنی تذکروں کی اہمیت و افادیت کو واضح کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد حاکم نے انداز میں
لکھتے ہیں۔

”شعرائے دکن کی نسبت تذکروں کی ناقص معلومات کے مد نظر گلشنِ گفتار کی
اطلاعات اس لحاظ سے کہ اس کا مؤلف خود دکن کا باشندہ تھا اور اکثر دکنی
شاعروں سے شخصی طور پر واقف تھا، زیادہ مستند و معتبر ہیں اور جن دکنی
شاعروں کا ذکر دوسرے تذکروں میں قطعاً مفقود ہے ان کے متعلق اس
تذکرہ کے بیانات سے اہل تحقیق کو بڑی مدد مل سکتی ہے یہ

مجموعی اعتبار سے دکنی تذکرے اس وجہ سے اہمیت و افادیت کی صلاحیت رکھتے
ہیں کہ ان کے ذریعہ دکن میں شعر و ادب کی روش اور یہاں کی ادبی سرگرمیوں سے واقفیت ہوتی
ہے اس کے علاوہ دکنی تذکرے تنقیدی اشاروں کے ذریعہ اپنے عہد کی تاریخ اور زبان کی نشاندہی کرتے
ہیں۔ دکن میں تحریر کردہ تمام تذکروں میں شاعری کے ارتقاء کا واضح خاکہ نظر آتا ہے۔ اس کے
ساتھ ساتھ تذکروں کا معیار بھی ابتدا سے ارتقاء کے مراحل طے کے ایک خاص نمائندہ ہے پر
مرکوز ہو جاتا ہے۔ محاسن اور معائب کے پس منظر میں دکنی تذکرے اپنے دور کی یادگار ہیں جن کے
ذریعہ سماج کے اس تخلیق کار طبقہ کی نمائندگی ہوتی ہے جو ادب کی دنیا میں شاعر کے نام سے یاد
کیا جاتا ہے۔ دکن کے تمام تذکرے شاعروں کی زندگی کے حالات اور ان کا منتخب کلام پیش
کرتے دکنی ادب کی تاریخ کو فنی تذکرہ کی روایت سے مربوط کرتے ہیں جو موجودہ تحقیق کے لحاظ
سے اردو کی پہلی صنفِ نثر ہے۔

۱۔ مقدمہ گلشنِ گفتار ص ۸۹، ۲۔ حاجہ حمید الدین اورنگ آبادی۔ مرتبہ پروفیسر سید محمد۔ مطبوعہ
خورشید پریس حیدرآباد ۱۹۳۲ء۔

۲۳۱

کتابیات

فہرست ماخذات

قلمی

- ۱۔ بہارستان سخن
- ۲۔ تذکرہ جوہر فرد
- ۳۔ تذکرہ خوش نویسان
- ۴۔ تحفۃ الکرام
- ۵۔ جمعات شاہیہ
- ۶۔ دستور الشعرا
- دو خزینۃ الامثال
- ۷۔ لندہ کامل عیار ترجمہ
- محیار الاشعار
- ۸۔ سلسلہ مشاعر طریقت
- ۹۔ شجرۃ المحمود
- ۱۰۔ شجرۃ الانساب
- ۱۱۔ کشکول
- میر عبد الرزاق حسینی
- سید محمد علی بلخ آبادی
- مرزا محمد علی
-
-
- شمس الدین فیض
- منظفر علی خاں احمد
- فدا علی درویش
- محمد بنیر الدین ہشتی محمد
- گردھاری پوشاد باقی
- فرید الدین خاں خورشیدی
- اسٹیٹ سنٹرل لائبریری ۱۱۷۲ء
- عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری ۱۹۵۹ء
- سالار جنگ میوزیم لائبریری ۱۳۲۳ھ
-
-
- انجمن ترقی اردو - گوجرانچ
-
-
- اسٹیٹ سنٹرل لائبریری -
- " "
- عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری -
- اسٹیٹ سنٹرل لائبریری ۱۳۵۳ھ
- عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری ۱۳۲۷ھ
- سالار جنگ میوزیم لائبریری ۱۳۲۶ھ

بیاض و سلاسل کے نمائندہ تذکرے

- | | | |
|----------------------------|-------------------------|-------------------------|
| عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری | بوسط سید ابراہیم بدالشی | ۱۔ بیاض اشعار شعراء دکن |
| اسٹیٹ سنٹرل لائبریری | مرزا ابوالفضل عباسی | ۲۔ حکایات الشعراء |
| عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری | - | ۳۔ رسالہ احوال پغمبرال |
| " " | ایمن | ۴۔ رموز العارفین |
| " " | فدا علی درویش | ۵۔ سلسلہ مشائخ طریقت |
| " " | محمد فخر الدین حسینی | ۶۔ سلک جواہر |
| " " | سید جلال الدین اکمل | ۷۔ مقصود السالکین |

دکن میں مطبوعہ تذکروں کی فہرست

نام کتاب	نام مؤلف	مطبع	سنہ تالیف
۱۔ اہتمام الشعراء	سید محمد عطاء علی	-	-
۲۔ احوال العارفین	محمد نعیم مسکین شاہ	مطبع فیض الکریم حیدرآباد	۱۳۱۵ھ
۳۔ اخبار الصالحین حصہ اول معشوق یار جنگ	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۳۵۲ھ	
۴۔ انوار جلالی	سید شاہ محمد حسینی	" "	-
۵۔ بارغ دلکش	مصمص شیرازی	مشیر عالم	۱۳۵۸ھ
۶۔ بیاض سخن	عبدالشکور شیدا	زندہ طلسمات	۱۳۵۵ھ
۷۔ تذکرہ	ریاست علی چشتی	"	۱۹۲۶ء
۸۔ تذکرہ اصفیا	ابوالخیر کنج نشین	صحیفہ	۱۳۶۲ھ
۹۔ تذکرہ آصفیہ	ابوالخیر شاہ	حیدرآباد	-
۱۰۔ تذکرہ اطباء عہد عثمانی	حکیم شفاء	"	۱۹۵۲ء
۱۱۔ تذکرہ الاولیاء	محمد حسام الدین	"	-
۱۲۔ تذکرہ الاولیاء	قلندر حسین اطہر	مدن اس	-
۱۳۔ تذکرہ الاولیاء	شیخ فرید الدین	"	-

- ۱۴۔ تذکرۃ الاولیاء محمد عبدالحی مطبع مخزن الاخبار ۱۹۰۰ء
- ۱۵۔ تذکرۃ اولیائے ابوالعلائیہ میر کاظم علی خاں حیدرآباد ۱۳۶۲ھ
- ۱۶۔ تذکرہ اولیائے حیدرآباد سید مراد علی طالع
- جلداول و دوم
- ۱۷۔ تذکرۃ اولیائے راجپور سید شاہ روشن علی قادری
- ۱۸۔ تذکرۃ باب حکومت محمد مظاہر حیدرآباد
- ۱۹۔ تذکرہ بابا شرف الدین رشید بادشاہ حیدرآباد
- ۲۰۔ تذکرہ بابہ محمد حبیب الرحمن خان حیدرآباد ۱۳۳۵ھ
- ۲۱۔ تذکرہ تیموریہ احمد شفیع "
- ۲۲۔ تذکرہ جمیل محمد عبدالرزاق بسمل "
- ۲۳۔ تذکرہ حسن محمد حسام الدین فاضل ۱۳۵۳ھ
- ۲۴۔ تذکرہ حسین "
- ۲۵۔ تذکرہ حضرت جلال الدین سخاوت مرزا ۱۹۹۲ھ
- ۲۶۔ تذکرہ حضرت سید محمد معین الدین اختر ۱۹۷۵ھ
- شاہ اسماعیل قادری
- ۲۷۔ تذکرہ حمید الدین چشتی ریا ضنت علی چشتی ۱۹۶۶ء
- ۲۸۔ تذکرہ خاصان خدا مصطفائی بیگم عظیم الشیم پریس حیدرآباد ۱۹۲۰ء
- ۲۹۔ تذکرۃ الخطابہ محمد عثمان عمادی حیدرآباد ۱۹۳۵ء
- ۳۰۔ تذکرہ خواتین دکن محمد الدین فوق لاہور ۱۹۲۰ء
- ۳۱۔ تذکرہ خواجہ عبداللہ خاں سید محمد اکرام الدین خاں حیدرآباد ۱۳۶۲ھ
- ۳۲۔ تذکرہ دارالعلوم نصیر الدین ہاشمی ۱۳۶۶ھ

- ۵۵۔ تذکرۃ افغانان سید شاہ محمد عید القدوس
۵۶۔ تذکرۃ یورپین سفر اُردو محمد سر دار علی
۵۷۔ چمنستان شعراء لالہ بھجی ناراین شفیق
۵۸۔ چہار چمن
۵۹۔ حالاتِ بزرگانِ سلسلہ
۶۰۔ روضہ شریف جہا راہبر سرکش پرشاد
۶۱۔ روضۃ الاقطاب رونق علی
۶۲۔ روضۃ المشائخ علی الدین انصاری
۶۳۔ سخنورانِ بلند فکر محمد منور گوہر
۶۴۔ شہ میری ادبیاء حکیم محمود بخاری
۶۵۔ قصص العلماء حضرت اعلیٰ محمد میرزا در علی رعد
۶۶۔ سگدستہ صحابیرہ نور احمد انصاری گنگوہی
۶۷۔ گلِ عجائب اسد علی خاں تمت
۶۸۔ محبوب فی المنن تذکرہ عبدالحجاری ملک پوری
۶۹۔ محبوب الزمن
۷۰۔ مخزن نکات شیخ قیام الدین قائم
۷۱۔ مختصر سرگذشت سرتپہ سر رشتہ تپہ سرکار عالی
۷۲۔ پشت گزار قاضی الملک صیفت اللہ دہلوی
۷۳۔ یادگار ضعیف محمد عبد اللہ خاں
۱۳۲۵ھ بنگلور
۱۹۳۴ء رزاقی مشین پریس حیدر آباد
۱۹۳۳ء انجن ترقی اُردو اورنگ آباد
مطبع معین الاسلام حیدر آباد
شمس الاسلام پریس حیدر آباد ۱۳۵۱ھ
محبوب پریس حیدر آباد
دگلداز پریس لکھنؤ
افضل برقی پریس حیدر آباد ۱۳۵۵ھ
جے۔ جے پریس مدراس ۱۹۳۷ء
برہم آستانہ شہ میرہ کٹپہ ۱۹۵۸ء
مطبع حیدری حیدر آباد
مطبع حیدری۔ حیدر آباد ۱۳۰۳ھ
انجن ترقی اُردو حیدر آباد ۱۹۳۶ء
حسن پریس حیدر آباد ۱۹۰۰ء
مطبع رحمانی حیدر آباد ۱۳۲۹ھ
مطبع انجن ترقی اُردو اورنگ آباد ۱۹۳۹ء
مطبع ٹپہ حیدر آباد
مدرسہ شرقیہ مدراس ۱۳۷۷ھ
مطبع گلزار دکن حیدر آباد ۱۳۷۳ھ

غیر مطبوعہ دینی تذکروں کی فہرست

مذکورہ کتاب	مؤلف کا نام	کتب خانہ کا نام
۱۔ تارالادشان	سید محمد نجی الدین خاں	کتب خانہ کانام
۲۔ تذکرہ جوہر فرد	سید محمد علی طبع آبادی	سالار جنگ میوزیم لائبریری مابین ۱۹۰۹ء
۳۔ تذکرہ خاندان خواجہ نعت الملک	حکیم شمس اللہ قادری	عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری ۱۹۳۴ء
۴۔ تذکرہ خوش نویسان	مرزا محمد علی	سالار جنگ میوزیم لائبریری ۱۳۲۳ھ
۵۔ تذکرہ شعرا	شیخ محمد علی حزیں	ادارہ ادبیات اردو لائبریری ۱۱۶۵ھ
۶۔ تذکرہ طوطیان ہند	مولانا تمکمن کاظمی	ادارہ ادبیات اردو لائبریری ۱۹۳۶ء
۷۔ تذکرہ عطاء سے تمکین	-	ادارہ ادبیات اردو لائبریری ۱۲۹۲ھ
۸۔ ریاض حسنی	عنایت اللہ فتوت	سنٹرل یکارڈ آف انس حیدر آباد ۱۲۰۳ھ
۹۔ شجرۃ المحمود	محمد نیر الدین چشتی	اسٹیت سنٹرل لائبریری ۱۳۶۰ھ
۱۰۔ شجرۃ الاتساب	گر دھاری پرشاد باقی	عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری ۱۳۰۹ھ
۱۱۔ کشکول	فرید الدین خاں خواجہ سنگی	سالار جنگ میوزیم لائبریری ۱۳۶۰ھ

اسٹیٹ سنٹرل لائبریری

شیر محمد خاں

۱۲- گلدرستہ گفتار

۱۳- ملفوظات حضرت

انجمن ترقی اردو پاکستان

سید محمد جوہر پوری

سالار جنگ میوزیم لائبریری

غلام علی آزاد بلگرامی

۱۴- ید بیضا

فہرست ماخذات

نام کتاب	مصنف	مطبع	تذکرہ
۱- آثار الصنادید	سرسید احمد خاں		
۲- احوال العارفین	محمد نعیم سکین شاہ	مطبع فیض الکریم حیدرآباد	۱۳۱۷ھ
۳- اخبار الصالحین	معشوق یار جنگ	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۳۵۲
۴- اردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین خاں		
۵- اردو نئے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	تاج پریس حیدرآباد	۱۹۲۵ء
۶- اردو میں سوانح نگاری	سید شاہ علی	گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی	۱۹۶۱ء
۷- بحر الحقائق	وجیہ الدین بگرامی	مملوکہ افسر صدیقی پاکستان	
۸- تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر جمیل جاہلی	ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس - دہلی	۱۹۷۷ء
۹- تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد	السیل بلاغ پریس کلکتہ	۱۹۲۵ء
۱۰- تذکرہ عظیم الامراء	عبد المجید صدیقی	مکتبہ ابراہیمیہ - حیدرآباد	۱۹۳۹ء
۱۱- تذکرہ یابر	محمد حبیب الرحمن خاں نثرانی	مطبع اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۳۴۵ھ
۱۲- تذکرہ تاریخ الاولیاء	محمد حسام الدین		
۱۳- تذکرہ تیموریہ	احمد شفیع	شمس المطابع پریس حیدرآباد	۱۹۵۵ء

- ۱۴- تذکرہ چغتایان شعراء رقیہ عطا کا کوئی
آرت پریس سلطان گنج پٹنہ ۱۹۶۹ء
- ۱۵- تذکرہ حسنی محمد حسام الدین فاضل
اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد ۱۳۵۸ھ
- ۱۶- تذکرہ حسین
" " "
- ۱۷- تذکرہ محضرت جلال الدین - سخاوت مرزا
۱۹۶۲ء
- ۱۸- تذکرہ الخطابہ محمد عثمان عمادی
" " "
- ۱۹- تذکرہ جمیل محمد عبدالرزاق بسمل شمس الاسلام
۱۹۲۵ء
- ۲۰- تذکرہ حمید الدین گدڑی - ریاضت علی چشتی
۱۹۶۶ء
- ۲۱- تذکرہ خاصان خدا مصطفائی بیگم
۱۹۴۰ء اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد
- ۲۲- تذکرہ خواجہ دکن محمد الدین فوق
۱۹۲۰ء لاہور
- ۲۳- تذکرہ خواجہ عبداللہ خاں سید محمد اکرام الدین
۱۳۹۲ھ حیدرآباد
- ۲۴- تذکرہ دارالعلوم نصیر الدین ہاشمی شمس المطابع
۱۳۶۲ھ حیدرآباد
- ۲۵- تذکرہ ذاکرین محمد علی خاں مشیر عالم پریس
۱۳۶۱ھ
- ۲۶- تذکرہ زینا سید شرف الدین شمس المطابع
۱۳۴۵ھ
- ۲۷- تذکرہ سادات ناصر الدین علی قادری
" " حیدرآباد
- ۲۸- تذکرہ سعید محمد افضل اقبال سعیدیہ لائبریری
۱۹۷۳ء حیدرآباد
- ۲۹- تذکرہ شجرہ قانون مرتبہ قانون عثمانیہ یونیورسٹی
۱۹۴۴ء حیدرآباد
- ۳۰- تذکرہ شعرائے اہل آباد محمد سردار علی
" " کتب خانہ میر جوگ حیدرآباد
- ۳۱- تذکرہ شعرائے دکن عبدالحجاز ملکاپوری
" " مطبع رحمن حیدرآباد ۱۳۲۹ھ
- ۳۲- تذکرہ طاعون محمود حمدان
۱۳۲۳ھ حیدرآباد
- ۳۳- تذکرہ علی محمد حسام الدین فاضل
" " "
- ۳۴- تذکرہ غوث دکن محمد تاج الدین
۱۳۸۶ھ